مقالہ بعنوان

اسلام کا نظام میراث اور اس میں خواتین کا حصہ

عقل ونقل کی روشنی میں

زیر انتظام

مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۴؍ جمادی الاول ۱۴۴۲ھ، مطابق ۹؍ جنوری ۲۰۲۱ء

از

محمد زید مظاہری ندوی

استاذ حدیث وفقہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

فہرست مضامین

اسلام ایک مکمل نظام حیات اور جامع دستور العمل	۳
اسلام میں مالی حقوق کی اہمیت اور کوتاہی پر سخت عذاب	۴
اسلام کی آمد سے پہلے دور جاہلیت اور دوسرے مذاہب میں عورتوں کے لئے میراث کا تصور	۵
اسلامی قانون میراث بندوں کی مصلحتوں اور حق تعالیٰ کی رحمت پر مبنی ہے	۷
اسلامی قانون میراث کے مختلف مدارج	۸
قانون میراث کا دوسرا مرحلہ	۹
اسلامی قانون میراث کا تیسرا مرحلہ	۱۰
رہتی دنیا تک سارے عالم پر اسلام کا احسان	۱۱
اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے عورتوں اور بچوں کا بھی میراث میں حصہ مقرر کیا	۱۱
استحقاق میراث کی بنیاد محض قرابت ہے نہ کہ خدمت وحاجت	۱۳
اس اعتراض کا علمی جائزہ کہ لڑکی کا حصہ لڑکے کے مقابلہ میں کم کیوں؟	۱۴
وہ صورتیں جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کا حصہ برابر ہے	۱۴
وہ صورتیں جن میں لڑکی کا حصہ لڑکے سے بھی زائد ہوتا ہے	۱۵
وہ صورتیں جن میں صرف عورت ہی وارث بنتی ہے	۱۶
ایک ضروری تنبیہ اور غلط فہمی کا ازالہ	۱۷
میراث کے حصہ متعین ہونے اور لڑکی کے مقابلہ میں لڑکے کو دوگنا ملنے کی عقلی مصلحتیں و حکمتیں	۱۸
دوسری مثال	۲۰
ایک بڑا مغالطہ اور اس کا جواب	۲۰
دور کے رشتہ دار جو قریبی رشتہ داروں کی وجہ سے میراث سے محروم ہو گئے ہوں ان کے متعلق میراث پانے والوں کے لئے شریعت کی ضروری ہدایات	۲۲
تقسیم میراث سے پہلے کرنے کے تین کام	۲۳
ضروری تنبیہ	۲۴
تقسیم میراث کے عمل کو انجام دینے کے لئے تین کاموں کی ضرورت	۲۵
پہلا مرحلہ	۲۵
دوسرا مرحلہ	۲۵
تیسرا مرحلہ	۲۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین، محمد وعلی آلہ وأصحابہ أجمعین.

اسلام ایک مکمل نظام حیات اور جامع دستور العمل

اسلام ایک مکمل نظام حیات اور جامع دستور العمل ہے، زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق اسلام کی واضح تعلیمات موجود نہ ہوں، مہد سے لے کر لحد تک، پیدائش سے لے کر موت تک زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اسلام نے دستور الٰہی پیش کیا ہے، اور اپنے پیروکاروں کو مخاطب کر کے کہا ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلاَ تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ، إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ."

(سورہ بقرہ، پ۲، آیت ۲۰۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو، کیونکہ وہ تو تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے بندوں کو ہدایت دی ہے کہ زندگی گذارنے میں ہر موقع کے لئے جو دستور تم کو دیا گیا ہے بس یہی سیدھا راستہ ہے، اس کے علاوہ جتنے بھی راستے ہوں گے وہ سب صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ہوں گے، چنانچہ ارشاد ہے:

"وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلاَ تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ."

(سورہ انعام، پ۸، آیت ۱۵۳)

ترجمہ: اور یہ بھی کہہ دیجئے کہ یہ میری سیدھی راہ ہے سو اسی راہ پر چلو، اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ تم کو اللہ سے جدا کر دیں گی، ان سب کا اللہ نے تم کو حکم دیا ہے، تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

اسلام نے اپنے پیروکاروں کو جو نظام حیات اور دستور العمل دیا ہے اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عقائد و عبادات سے لے کر معاملات و معاشرت اور معیشت تک کی واضح ہدایات موجود ہیں، ہماری معاشرتی اور عائلی زندگی کا تعلق نکاح و طلاق اور میراث سے بھی ہے، جس کے متعلق قرآن پاک میں عبادات سے زیادہ وضاحت و صراحت سے احکام بیان کئے گئے ہیں، اس وقت احقر معاشرتی زندگی کے صرف ایک گوشہ (یعنی اسلام کا نظام میراث اور خواتین کا حصہ عقل و نقل کی روشنی میں) سے متعلق اسلامی تعلیمات کا خلاصہ عرض کرنا چاہتا ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ میراث کے تعلق سے خواتین کے لئے اسلام نے جو نظام بندگان خدا کو دیا ہے وہ عین عقل و فطرت کے مطابق ہے، اس سے بہتر نہ کوئی نظام تھا اور نہ ہی آئندہ اس کا تصور کیا جا سکتا ہے، اس نظام میراث کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا ہے:

"تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ، وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا، وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ، وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا، وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ."

(سورہ نساء، پ۴، آیت ۱۳، ۱۴)

ترجمہ: یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ اس کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ایسے لوگ ہمیشہ ان باغات میں رہیں گے، اور یہ زبردست کامیابی ہے، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کرے گا اسے اللہ دوزخ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کو ایسا عذاب ہوگا جو ذلیل کر کے رکھ دے گا۔

اسلام کا دیا ہوا یہ قانون میراث نیز اس کے دیئے ہوئے جملہ احکام سب کے سب انسانی فطرت کے مطابق اور نہایت عدل وعقل اور حق تعالیٰ کی رحمت پر مبنی ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر انسانوں کے خلقی ضعف اور بعض مالی حقوق کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا:

"إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا." (سورہ نساء، پ۵، آیت ۲۹)

ترجمہ: یقین جانو اللہ تعالیٰ تم پر بہت مہربان ہے۔

یعنی اس کے جملہ احکام میں بندوں کے لئے حق تعالیٰ کی طرف سے شفقت ورحمت ہے۔

ان احکام کی خلاف ورزی کرنے پر نہ صرف یہ کہ آخرت تباہ وبرباد ہوگی اور یوم جزاء میں ایسا شخص سخت عذاب کا مستحق ہوگا بلکہ اس دنیا میں بھی اس کی معاشرتی زندگی تباہ وبرباد اور اس کا قلبی سکون غارت ہوگا، اس لئے اسلام کے دیئے ہوئے قانون معاشرت میں نظام میراث کو کتاب وسنت اور عقل وفطرت کی روشنی میں سمجھنے اور پورے انشراح کے ساتھ اس کے مطابق عمل کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ ایمان نام ہے احکام الٰہیہ کی حقانیت اور صداقت کے یقین اور دل سے ماننے کا، اور اسلام نام ہے اپنی طرف سے مکمل سپردگی اور بلا چوں وچرا کامل اطاعت کا، اس لئے اگر واقعۃً ہم اسلام وایمان کے مدعی ہیں تو اس کی جملہ ہدایات اور کتاب وسنت میں بیان کردہ تمام احکام کو تسلیم کرنا اور اس کے مطابق عمل کرنا فرائض اسلام وایمان میں سے ہے، ورنہ ہمارا اسلام کا دعوی محض دعوی بلا دلیل ہوگا۔

اسلام میں مالی حقوق کی اہمیت اور کوتاہی پر سخت عذاب

رسول اللہ ﷺ کے بعض ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے لوگوں کے مالی حقوق ضائع کئے، مثلاً باپ کے مرنے کے بعد اس کی میراث کو شرعی طور پر تقسیم نہیں کیا، ماں، بیوی، بیٹی اور یتیم، بچہ کا حصہ ان کو نہیں دیا، ایسے لوگ قیامت کے دن سب سے زیادہ مسکین، کنگال اور قلاش ہوں گے، یوم آخرت میں ان سے زیادہ بے کس محتاج اور کنگال کوئی اور نہ ہوگا، حدیث پاک کے بموجب ایسے لوگ خواہ کتنی ہی عبادات نماز روزہ وغیرہ کرکے آئیں، لیکن قیامت کے روز ان کی عبادتیں ان کے کام نہ آئیں گی، بلکہ ان لوگوں کو اس کی نیکیاں دلا دی جائیں گی، جن جن کے حقوق اس شخص نے پامال کئے تھے، اور آخر میں فرشتوں کو حکم ہوگا کہ اس کو گھسیٹ کر دوزخ میں پھینک دو، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"عن أبی هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: أتدرون ما المفلس؟ قالو: المفلس فينا من لا درهم له ولا متاع، فقال: إن المفلس من أمتي من يأتي يوم القيامة بصلاة وصيام وزكوٰة، ويأتی قد شتم هذا، وقذف هذا، وأكل مال هذا، وسفک دم هذا، وضرب هذا، فيعطى هذا من حسناته، وهذا من حسناته، فإن فنئت حسناته قبل أن يقضى ما عليه، أخذ من خطاياهم، فطرحت عليه، ثم طرح فی النار"

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحريم الظلم، حدیث ۶۵۷۳)

اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وقت میں ایک صاحب نے اسی نوع کے بعض مسائل میں جن کا تعلق وصیت اور میراث سے تھا، شریعت کی بیان کردہ حدود وقیود کا لحاظ نہ کرتے ہوئے اپنی میراث سے ورثاء کو محروم کرنے کی کوشش کی اس طرح کہ شرعی ضابطہ کے مطابق وصیت تو صرف تہائی مال میں جائز ہوتی ہے، لیکن ایک صاحب نے اپنی وفات کے وقت ۶ / غلام (اور وہی ان کا کل سرمایہ تھا) سب کو آزاد کردیا، حالانکہ تہائی مال سے زائد کی وصیت کا جواز نہ تھا، رسول اللہ ﷺ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ ان پر سخت ناراض ہوئے، اور یہاں تک فرمایا کہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس کی نماز جنازہ نہ پڑھوں گا، اگر مجھے پہلے

سے اس کی حرکتوں کا علم ہو گیا ہوتا تو میں اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے نہ دیتا، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

’’إن رجلا أعتق ستة مملوكين له عند موته لم يكن له مال غيرهم.......إلى أن قال: قال له قولا شديداً.‘‘

(صحیح مسلم، كتاب الأيمان، باب صحبة المماليك، حدیث ۴۳۳۴)

’’وفي رواية النسائي: وقال: لقد هممت أن لا أصلي عليه.‘‘

(سنن نسائی، كتاب الجنائز، باب الصلوة على من يحيف في وصيته، حدیث ۱۹۵۸)

’’وفي رواية أبي داؤد: وقال: لو شهدته قبل أن يدفن لم يدفن في مقابر المسلمين‘‘

(سنن ابوداوٗد، كتاب العتق، باب فيمن أعتق عبيداً له، حدیث ۳۹۶۰)

اس سے اندازہ لگانا چاہیے کہ شریعت مقدسہ میں مالی حقوق، وصیت اور میراث کے احکام کی کتنی اہمیت ہے۔

اسلام کی آمد سے پہلے دور جاہلیت اور دوسرے مذاہب میں عورتوں کے لئے میراث کا تصور

اسلام سے پہلے دور جاہلیت میں نیز دوسرے مذاہب میں بھی عورتوں کو میراث دینے کا کوئی تصور نہ تھا، بلکہ عورتیں خود میراث کا ایک حصہ سمجھی جاتی تھیں، یعنی بطور میراث ان پر قبضہ کیا جاتا تھا، اوران کو اپنے تصرف میں لایا جاتا تھا۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

☆ ’’جاہلی معاشرہ میں عورت کے ساتھ ظلم وبدسلوکی عام طور سے روا سمجھی جاتی تھی، اس کے حقوق پامال کئے جاتے، اس کا مال مرد اپنا مال سمجھتے، وہ ترکہ اور میراث میں کچھ حصہ نہ پاتی، شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد اس کی اجازت نہیں تھی کہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح کر سکے، دوسرے سامان اور حیوانات کی طرح وہ بھی وراثت میں منتقل ہوتی رہتی تھی۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، صفحہ ۵۰، ۵۱)

☆ حضرت سعید بن جبیرؒ اور حضرت قتادہؒ سے مروی ہے کہ مشرکین صرف بالغ مردوں کو میراث میں حصہ دیتے، عورتوں اور نابالغ بچوں کو میراث سے محروم رکھتے تھے، اسی لئے جب قرآن میں عورتوں، بچوں کو میراث دینے کا حکم نازل ہوا تو بعض اہل عرب کو اشکال ہوا اور انہوں نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ ایک لڑکی کو باپ کا آدھا ترکہ دیا جائے گا، حالاں کہ وہ تو نہ گھوڑے پر سواری کر پاتی ہے نہ جنگ کر سکتی ہے اور بچوں کو میراث دی جائے گی، حالاں کہ وہ کسی کام نہیں آتے۔

’’قال سعيد بن جبير وقتادة: كان المشركون يجعلون المال للرجال الكبار، ولا يورثون النساء ولا الأطفال شيئا، فأنزل الله للرجال نصيب مما ترك الوالدان......الخ.‘‘

(تفسیر ابن کثیر، جلد دوم، صفحہ ۲۱۹، تحت قوله تعالیٰ: للرجال نصيب مما ترك الوالدان والأقربون)

☆ ڈاکٹر محمد یوسف اپنی کتاب ’’التركة والميراث‘‘ میں تحریر فرماتے ہیں:

’’اسلام سے پہلے عرب میں لڑکیاں میراث سے بالکل محروم رہتی تھیں کیونکہ ان کے عرف ورواج میں میراث کا استحقاق صرف ان بالغ مردوں کو ہوتا تھا جو جنگ میں لڑنے کے قابل ہوتے تھے، اور عورتیں میراث سے بالکل محروم ہوتی تھیں۔‘‘ (التركة والميراث، صفحہ ۱۵)

☆ اسلام سے پہلے دور جاہلیت میں عورتوں کی جو حیثیت تھی حضرت مولانا مفتی عتیق احمد صاحب بستوی دامت برکاتہم نے اس پر بڑی اچھی روشنی ڈالی ہے، تحریر فرماتے ہیں:

’’اسلام سے پہلے عموماً عورت کو ملکیت اور میراث کے حقوق حاصل نہیں تھے، اور اگر حاصل تھے تو سوسائٹی میں ان حقوق کا احترام نہیں تھا، شادی سے پہلے عورت باپ کی ملکیت تصور کی جاتی تھی، اس کی محنت اور کمائی باپ کی جیب میں جاتی تھی، باپ جس طرح اسے چاہتا رکھتا، جہاں چاہتا اس کی شادی کرتا، خواہ عورت اس رشتہ پر راضی ہوتی یا ناراض، شوہر کے گھر آنے کے بعد وہ اور

اس کی ساری ملکیت شوہر کے رحم وکرم پر ہوتی ،شوہر کے گھر میں اس کی حیثیت لونڈی اورنوکرانی سے زیادہ نہ ہوتی ،شوہر کی وفات کے بعدوہ کٹی پتنگ کی طرح ہوتی ، نہ میکہ میں اس کا کوئی حق تھا نہ سسرال میں ،مرنے والے شوہر کی املاک کی طرح وہ بھی میراث کا ایک حصہ سمجھی جاتی ،شوہر کے ورثاء اسے جس طرح چاہتے رکھتے ،کبھی خوداس کا سوتیلا لڑکا اس سے نکاح کرلیتا ،کبھی شوہر کے ورثاء اپنی مرضی سے اس کا نکاح کرتے اور کبھی اسے نکاح نہ کرنے دیتے اور رفیق حیات کے سہارے کے بغیر شوہر کے گھر میں لونڈی اور نوکرانی کی طرح اسے زندگی گزارنی پڑتی۔ (اسلام کا نظام میراث ،صفحہ ۲۰، ۲۱)

☆ یہودیوں کے یہاں قانون میراث میں ماں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ بالکلیہ میراث سے محروم ہوتی تھی ،عورت نہ اپنے لڑکے کی میراث پاتی تھی نہ لڑکی کی ،میت اگر لا ولد ہے تو بھی ماں کو میراث نہیں ملتی تھی ، بلکہ پوری میراث باپ ، دادا یا پر دادا کو ملتی تھی ، ماں بہرصورت میراث سے محروم رہتی تھی۔

(ملاحظہ ہو ڈاکٹر عبدالکریم زیدان کی کتاب ”المفصل فی أحکام المرأة، صفحہ ۲۷۳، ماخوذ از: اسلام کا نظام میراث ،صفحہ ۲۷)

☆ یہودیوں کے قانون میراث میں باپ کے ترکہ کا استحقاق صرف لڑکوں کو تھا ،لڑکیاں اس میں حصہ دار نہیں تھیں ، ہاں لڑکی اگر چھوٹی ہے تو شادی ہونے تک یا بالغ ہونے تک اسے باپ کے ترکہ سے اپنا خرچ لینے کا حق تھا۔

(الترکة والمیراث فی الإسلام، ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ ،صفحہ ۱۴، ۱۵، ماخوذ از اسلام کا نظام میراث ،صفحہ ۲۵)

☆ یہودیوں کے مذہب میں یہ قانون بھی ہے کہ شوہر تو بیوی کے ترکہ کا وارث ہوتا ہے ،لیکن بیوی شوہر کے ترکہ میں حصہ دار نہیں ہوتی اوراس کو شوہر کی میراث میں کچھ حصہ نہیں ملتا۔ (حوالہ مذکورہ ،صفحہ ۴۱)

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے کہ اس نے بندگان خدا کو ایسا جامع میراث کا نظام اور دستور دیا ہے کہ اس سے پہلے اس جامعیت سے اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا ،اسلام کے قانون میراث میں جس طرح مرنے والے کے باپ کے لئے حصہ متعین ہے ،اسی طرح ماں کے لئے بھی حصہ متعین ہے ، بیٹے کی طرح بیٹی کو بھی وارث قرار دیا گیا ہے ، بھائی کی طرح بہن کو بھی وارث بنایا گیا ہے ،شوہر کی طرح بیوی بھی میراث میں حصہ دار بنتی ہے ،قرابت کے قرب اور بعد کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے حصوں میں فرق ضرور رکھا گیا ہے ،لیکن ایسا نہیں ہے کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کو میراث سے محروم رکھا گیا ہو ،خواتین میں بعض ورثاء مثلاً ماں ، بیوی ، بیٹی تو ایسے ہیں کہ ہر حال میں میراث سے حصہ ضرور پاتے ہیں کسی بھی حال میں محروم نہیں ہوتے ،البتہ دور کے رشتہ دار اگر چہ وہ بھی وارث ہوتے ہیں ،لیکن قریبی رشتہ داروں کی موجودگی یا تو بالکل محروم ہوتے ہیں یا ان کا حصہ کم ہو جاتا ہے ،مثلاً مرنے والے کے ماں ، باپ ، بیٹا اور بیٹی کے ہوتے ہوئے دادا ، دادی ، بھائی اور بہن محروم کر دیئے جاتے ہیں ، یہ ضابطہ شرعیہ عین فطرت اور انصاف کے مطابق ہے ،الغرض اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے خواتین کو مختلف جہتوں سے عزت بخشی ان کو بلند مقام عطا کیا اور میراث کے مال میں بھی ان کا حصہ متعین کیا ، ماں ہونے کی حیثیت سے بھی ، بیوی ہونے کی حیثیت سے بھی ، بہن ہونے کی حیثیت سے بھی اور بیٹی ہونے کی حیثیت سے بھی۔

البتہ بعض صورتوں میں بیٹی کا حصہ بیٹے کے مقابلہ میں نصف رکھا گیا ،ایسا کیوں اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

اسلامی قانون میراث بندوں کی مصلحتوں اورحق تعالیٰ کی رحمت پر مبنی ہے

اسلامی قانون میراث کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے حکم کی بنیاد ہی محض بندوں کی مصلحت اور حق تعالیٰ کی رحمت پر ہے ، وہ علیم وخبیر ہے ، بندوں کے مصالح اور ان کے حالات ونفسیات سے واقف ہے ، وہ رؤف ورحیم اوراپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے ،اس لئے میراث کا کوئی حکم بندوں کی حکمت ومصلحت اور حق تعالیٰ کی رحمت وشفقت سے خالی نہیں ، میراث کے

احکام جومختلف مراحل میں نازل کئے گئے، ان میں ہر موقع اور ہر حالت میں بندوں ہی کے مصالح کی رعایت کی گئی، سب سے آخری مرحلہ جس میں ہر ہر وارث کا حصہ تعیین کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے وہ اس کا آخری اور حتمی فیصلہ ہے جو عقل وفطرت کے بالکل مطابق اور عدل وانصاف پر مبنی ہے۔

مفسّر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ اور حکمت بالغہ کی وجہ سے مرنے والے انسان کو چھوڑے ہوئے مال کا مستحق اسی کے قریبی عزیزوں رشتہ داروں کو قرار دیا ہے، حالانکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ جس کو جو کچھ دنیا میں ملا وہ سب کا سب اللہ تعالیٰ کی ملک حقیقی تھا، اسی کی طرف سے زندگی بھر استعمال کرنے، نفع اٹھانے کے لئے انسان کو دے کر عارضی مالک بنا دیا گیا تھا، اس لئے تقاضائے عقل و انصاف تو یہ تھا کہ ہر مرنے والے کا ترکہ اللہ تعالیٰ کی ملک کی طرف لوٹ جاتا جس کی عملی صورت اسلامی بیت المال میں داخل کرنا تھا، جس کے ذریعہ ساری خلق خدا تعالیٰ کی پرورش اور تربیت ہوتی ہے، مگر ایسا کرنے میں ایک تو ہر انسان کے طبعی جذبات کو ٹھیس لگتی، جب کہ وہ جانتا کہ میرا مال میرے بعد نہ میری اولاد کو ملے گا، نہ ماں باپ اور بیوی کو، اور پھر اس کا یہ نتیجہ بھی طبعی طور پر لازمی سا تھا کہ کوئی شخص اپنا مال بڑھانے اور اس کو محفوظ رکھنے کی فکر نہ کرتا صرف اپنی زندگی کی حد تک ضروریات جمع رکھنے سے زائد کوئی شخص محنت وجانفشانی نہ کرتا، اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ پورے انسانوں اور شہروں کے لئے تباہی وبربادی کی صورت اختیار کرتا۔

اس لئے حق تعالیٰ جل شانہ نے میراث کو انسان کے رشتہ داروں کا حق قرار دے دیا بالخصوص ایسے رشتہ داروں کا جن کے فائدہ ہی کے لئے وہ اپنی زندگی میں مال جمع کرتا اور طرح طرح کی محنت مشقت اٹھاتا تھا۔'' (معارف القرآن، سورہ انفال، جلد۴، صفحہ۲۹۴)

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ پورا قانون میراث ہی بندوں کے مصالح وحالات کے مطابق اور حق تعالیٰ کی رحمت پر مبنی ہے، جو مختلف مراحل سے گذر کر تیسرے مرحلہ میں سورہ نساء کی آیت میراث پر منتہی ہوگیا اور قیامت تک جاری رہے گا، احکام میراث تدریجاً مختلف مراحل میں نازل کرنے میں بھی حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے، ایک تو یہ کہ اس میں بندوں کے مصالح وحالات کا لحاظ کیا گیا، دوسرے شریعت مطہرہ جس کسی بڑے اور اہم حکم کا بندوں کو مکلّف بنانا چاہتی ہے، خصوصاً ایسے احکام جو اس وقت کے عرف وعادت اور رواج وسماج کے بھی خلاف ہو تو شریعت حکمت عملی کو اختیار کرتے ہوئے تدریجاً ان میں احکام نازل کرتی ہے، مثلاً شراب کی حرمت کو بیان کرنا تھا تو ایک عرصہ تک اس کی قباحتوں کو بیان کر کے ذہن سازی کی گئی، پھر نماز کے وقت اس کے پینے کو حرام کیا گیا، اس کے بعد مطلقاً تمام اوقات میں ہمیشہ کے لئے اس کو حرام کر دیا گیا، اسی طرح دوسرے بھی بہت سے احکام میں کیا گیا۔

اسی طرح میراث کے احکام بھی مختلف حالات ومصالح کے پیش نظر مختلف مراحل میں نازل کئے گئے، اور آخری مرحلہ تک پہنچا کر قیامت تک کے لئے اس کو دستوری حیثیت دے دی گئی، جس کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:

اسلامی قانون میراث کے مختلف مدارج

پہلا مرحلہ: میراث کے باب میں سب سے پہلا حکم جس کو اللہ تعالیٰ نے بندوں پر نازل کیا اور رسول اللہ ﷺ نے مہاجر وانصار صحابہ کے درمیان اس کو مشروع اور رائج فرمایا جس کا تذکرہ سورہ انفال کی اس آیت میں ہے:

''إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَّنَصَرُوا أُولٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ، وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِنْ وَّلَايَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوا، وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ، وَالَّذِينَ

كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ." (سورہ انفال، پ۹، آیت۷۲،۷۳)

ترجمہ: بیشک جولوگ ایمان لائے دین کے لئے وطن چھوڑا اور اپنی جان و مال سے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا، اور جن لوگوں نے (ہجرت کرنے والوں کو پناہ دی) اور مدد کی، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور جولوگ ایمان تو لائے مگر (قدرت کے باوجود) ہجرت نہیں کی تو جب تک وہ ہجرت نہ کریں، تم لوگوں کی ان سے کوئی دوستی نہیں اور اگر وہ دین کے کام میں تم لوگوں سے مدد چاہیں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے مگر ایسی قوم کے مقابلہ میں نہیں جن کا تم سے معاہدہ ہو، اور جو کچھ تم کررہے ہو اللہ اسے خوب دیکھ رہے ہیں، اور کفر کرنے والے ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

بخاری شریف کی روایت میں اس کی تفصیل موجود ہے:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مہاجر صحابہ جب ہجرت کرکے مدینہ پاک آئے تو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے مقیم صحابہ یعنی انصار اور مہاجر صحابہ کے درمیان مواخاۃ (یعنی اخوت کا رشتہ) قائم فرمایا اگرچہ ان کے درمیان کسی نوع کی قرابت اور رشتہ داری نہ ہو، جس کے نتیجہ میں مہاجر و انصار، صحابہ ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے، لیکن ایک مدت کے بعد دوسری آیتوں سے یہ حکم منسوخ ہوگیا، روایت کے الفاظ یہ ہیں

"عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: كان المهاجرون حين قدموا المدينة يرث الأنصاري المهاجري دون ذوي رحمه، للإخوة التي آخى النبي ﷺ بينهم، فلما نزلت لكل جعلنا موالي مما ترك الوالدان.....، قال: نسختها والذين عقدت أيمانهم." (صحیح بخاری، كتاب الفرائض، باب ذوي الأرحام، حديث ٦٧٤٧)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

"سورہ انفال کی آخری آیت "وأولو الأرحام" میں قانون میراث کا ایک جامع ضابطہ بیان کیا گیا ہے، جس کے ذریعہ ایک عارضی حکم کو منسوخ کیا گیا ہے، جو اوائل ہجرت میں مہاجرین وانصار کے درمیان مواخاۃ کے ذریعہ ایک دوسرے کا وارث بننے کے متعلق جاری ہوا تھا۔

سورہ انفال کی اس آخری آیت کے آخری جملہ نے اسلامی وراثت کا وہ قانون منسوخ کردیا جو اس سے پہلے پہلی آیات میں مذکور ہے، جس کی رو سے مہاجرین وانصار میں باہمی وراثت جاری ہوتی تھی، اگرچہ ان کے درمیان کوئی رشتہ داری نہ ہو، کیونکہ یہ حکم ایک ہنگامی حکم ہے جو اوائل ہجرت کے وقت دیا گیا تھا۔ (معارف القرآن، سورہ انفال، جلد۴، صفحہ۳۰۱)

قانون میراث کا دوسرا مرحلہ

شیریعت مقدسہ کے قانون میراث میں تدریجی طور پر جو ارتقاء ہوا ہے اس کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ انصار و مہاجرین کے درمیان میراث کا حکم منسوخ ہوجانے کے بعد شریعت نے اس بات کا مکلّف بنایا کہ تمہارا ترکہ اور میراث کا مال اصلاً تمہارے بیٹے کے لئے ہے، بیٹے کے علاوہ دوسرے قریبی رشتہ داروں مثلاً ماں باپ وغیرہ کے لئے کچھ مال کی وصیت کرجانا تم پر فرض ہے، ان کے حق میں تم جو وصیت کرجاؤ گے اس کے مطابق تمہارا مال ان کو دیا جائے گا، چنانچہ مرنے والا اگر والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے اپنے مال کی کچھ وصیت کرجاتا تو اس کی وصیت کے مطابق ہی ان کو بھی مال مل جاتا، ورنہ بیٹے کے مال سے باپ کو بھی کچھ نہ ملتا تھا، یہ مرحلہ ایسا تھا کہ اس میں مرنے والے کو مرنے سے قبل اپنے مال کے متعلق وصیت کرنا فرض تھا، جس کا تذکرہ سورہ بقرہ کی اس آیت میں ہے:

"كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْراً الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ، حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ."

(سورہ بقرہ، پ۲، آیت۱۸۰)

ترجمہ: جب تم میں سے کسی پر موت (کا وقت قریب) آجائے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر والدین اور رشتہ داروں کے لئے مناسب طریقہ پر وصیت کرنا فرض ہے، یہ تقویٰ والوں پر لازم ہے۔

بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ ابتداء میں مرنے والے کا مال اس کے لڑکے کو ملتا تھا، اور والدین کے لئے وصیت ہوتی تھی، یعنی والدین اور دوسرے رشتہ داروں کو بھی اگر مال کا استحقاق ہوتا تو اس کی وصیت کے مطابق ہوتا تھا، کیونکہ ابھی شریعت نے کسی رشتہ دار کا حصہ مقرر نہیں کیا تھا، اور اپنے مال سے متعلق یہ وصیت کرنا ہر شخص پر واجب تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو بھی منسوخ کر دیا، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"عن ابن عباسؓ قال: كان المال للولد، وكانت الوصية للوالدين، فنسخ الله من ذلك ما أحب، فجعل للذكر مثل حظ الأنثيين، وجعل للأبوين لكل واحد منهما السدس، وجعل للمرأة الثمن والربع، وللزوج الشطر والربع." (صحیح بخاری، كتاب الفرائض، باب ميراث الزوج مع الولد، حدیث ۶۷۳۹)

روایت کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

''ابتداء میں مورث کا سارا مال اس کے لڑکے کا ہوتا تھا، البتہ اس کے ماں باپ کو اس کی وصیت کے مطابق مال کا استحقاق ہوتا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا، اور بیٹے کے لئے بیٹی کا دوگنا اور ماں باپ میں سے ہر ایک کے لئے سدس (یعنی چھٹواں حصہ) اور بیوی کے لئے ثُمن (یعنی آٹھواں حصہ) اور بعض صورتوں میں ربع (یعنی چوتھائی حصہ) اور شوہر کے لئے نصف (یعنی آدھا حصہ) اور بعض صورتوں میں ربع (یعنی چوتھائی حصہ) مشروع کر دیا۔

اسلامی قانون میراث کا تیسرا مرحلہ

اسلامی قانون میراث کا تیسرا مرحلہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ سورہ نساء کی آیت میراث **"يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ أَوْلَادِكُمْ"** پورا رکوع نازل ہوا، جس میں تعیین کے ساتھ ہر ہر وارث کے حصہ اور اس کی نوعیت و کیفیت کو بھی بیان کر دیا گیا ہے۔

علامہ عینیؒ اور دوسرے مفسرین و محدثین نے تصریح فرمائی ہے کہ مذکورہ آیت میراث نے سابقہ حکم کو بھی منسوخ کر دیا جس میں مرنے والے کو وصیت کرنا فرض قرار دیا گیا تھا۔ (عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، جلد ۲۳، صفحہ ۲۴۲)

اسی کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کے سامنے ارشاد فرمایا جس کو امام ترمذیؒ نے نقل فرمایا ہے:

"إن الله أعطى لكل ذي حق حقه فلا وصية لوارث." (جامع الترمذی، أبواب الوصايا، حدیث ۲۱۲۰)

''اللہ تعالیٰ نے ہر ایک حق والے کو اس کا حق خود دے دیا ہے اس لئے اب کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔''

اسی حدیث میں بروایت ابن عباسؓ یہ الفاظ بھی منقول ہیں: **"لا وصية لوارث إلا أن تجيزه الورثة."**

''کسی وارث کے لئے وصیت اس وقت تک جائز نہیں جب تک باقی سب وارث اجازت نہ دے دیں۔''

(معارف القرآن، جلد اول، صفحہ ۴۳۹)

اسلامی قانون میراث کا یہ تیسرا اور آخری مرحلہ ہے جس نے میراث کے سلسلہ کے سابقہ حکم کو بھی منسوخ کر دیا، اور قیامت تک کے لئے اب میراث کا یہی قانون متعین ہو گیا، رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اسی کے مطابق اعلان کر دیا، اور تمام صحابہ اس کے شاہد بن گئے۔

آیت میراث میں ذکر کردہ احکام میراث اور وارثوں کے حصے اتنی وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں کہ اس میں کسی صحابی

اور ائمہ مجتہدین میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے، نیز نماز و روزہ کی تعداد کی طرح اس کے احکام وسہام اتنے واضح اور بدیہی ہیں کہ ان میں کسی فرد یا جماعت کے لئے اپنی عقل وفہم اور کسی قیاس کی بھی گنجائش نہیں، شریعت نے نظام میراث میں خواتین کے جو بھی حصے متعین کئے ہیں وہ بھی بلا شبہ انسانی فطرت اور عدل وعقل کے مطابق ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے میراث کے باب میں خواتین کو کتنی اہمیت دی ہے، جس کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے:

رہتی دنیا تک سارے عالم پر اسلام کا احسان

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے عورتوں اور بچوں کا بھی میراث میں حصہ مقرر کیا

جیسا کہ ماقبل میں عرض کیا گیا کہ اسلام سے پہلے دوسرے مذاہب اور دور جاہلیت میں عرب وعجم کے لوگوں میں نابالغ بچوں اور عورتوں کو میراث دینے کا رواج نہ تھا، ان کے عرف میں استحقاق میراث کے لئے ایسا مرد ہونا لازمی شرط تھی جو میدان جنگ میں لڑائی کر کے مال غنیمت حاصل کر سکے، اس بناء پر عورتیں اور چھوٹے بچے میراث سے محروم رہتے تھے، اسلام نے آکر اس ظالمانہ رواج کو ختم کیا، اور قطعی طور پر حکم دیا کہ میراث کا استحقاق قریبی رشتہ داروں کو ہے خواہ مرد ہو یا عورت، بڑے ہوں یا چھوٹے، بالغ ہوں یا نابالغ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

"لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا." (سورہ نساء، پ۴، آیت ۷)

ترجمہ: والدین اور قرابت داروں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے، اور والدین اور قرابت داروں کے متروکہ میں عورتوں کا بھی حصہ ہے، چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ مقرر کیا ہوا حصہ ہے۔

اس آیت کے شان نزول اور پس منظر کو بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

اسلام سے پہلے عرب اور عجم کی قوموں میں انسان کی صنف ضعیف یتیم بچے اور صنف نازک عورتیں ہمیشہ طرح طرح کے ظلم وستم کا شکار رہے ہیں، اول تو ان کا کوئی حق ہی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، اور اگر کوئی حق مان بھی لیا گیا تو مردوں سے اس کا وصول کرنا اور اس کا محفوظ رکھنا کسی کی قدرت میں نہ تھا۔

اسلام نے سب سے پہلے ان کو حقوق دلائے پھر ان حقوق کی حفاظت کا مکمل انتظام کیا، قانون وراثت میں بھی عام اقوام دنیا نے معاشرہ کے ان دونوں ضعیف اجزاء کو ان کے فطری اور واجبی حقوق سے محروم کیا ہوا تھا۔

عرب نے تو اصول ہی یہ بنالیا تھا کہ وراثت کا مستحق صرف وہ ہے جو گھوڑے پر سوار ہو، اور دشمنوں کا مقابلہ کر کے اس کا مال غنیمت جمع کرے۔ (روح المعانی، جلد۴، صفحہ ۲۱۰)

ظاہر ہے کہ یہ دونوں صنف ضعیف بچے اور عورتیں اس اصول پر نہیں آسکتیں، اس لئے ان کے اصول وراثت کی رو سے صرف جوان بالغ لڑکا ہی وارث ہوسکتا تھا، لڑکی مطلقاً وارث نہ سمجھی جاتی تھی، خواہ بالغ ہو یا نابالغ، اور لڑکا بھی اگر نابالغ ہوتا تو وہ بھی مستحق وراثت نہ تھا۔

رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں ایک واقعہ پیش آیا کہ اوس بن ثابتؓ کا انتقال ہوا، اور دولڑکیاں ایک لڑکا نابالغ اور ایک بیوی وارث چھوڑے، مگر عرب کے قدیم دستور کے مطابق ان کے دو چچا زاد بھائیوں نے آکر مرحوم کے پورے مال پر قبضہ کرلیا، اور اولاد اور بیوی میں سے کسی کو کچھ نہ دیا، کیونکہ ان کے نزدیک عورت مطلقاً مستحق وراثت نہ سمجھی جاتی تھی، خواہ بالغ ہو یا

نابالغ ،اس لئے بیوی اور دونوں لڑکیاں تو یوں محروم ہو گئیں ،اورلڑکا بوجہ نابالغ ہونے کے محروم کر دیا گیا،لہٰذا پورے مال کے وارث دو چچازاد بھائی ہو گئے ۔

اوس بن ثابتؓ کی بیوہ نے یہ بھی چاہا کہ یہ چچازاد بھائی جو پورے ترکہ پر قبضہ کر رہے ہیں،ان دونوں لڑکیوں سے شادی بھی کرلیں تاکہ ان کی فکر سے فراغت ہو،مگر انہوں نے یہ بھی قبول نہ کیا،تب اوس بن ثابتؓ کی بیوہ نے رسول کریم ﷺ سے عرض حال کیا،اوراپنی اوراپنے بچوں کی بے کسی اور محرومی کی شکایت کی ،اس وقت تک چونکہ قرآن حکیم میں آیت میراث نازل نہ ہوئی تھی،اس لئے آنحضرت ﷺ نے جواب دینے میں توقف کیا،آپ ﷺ کو اطمینان تھا کہ وحی الٰہی کے ذریعہ اس ظالمانہ قانون کو ضرور بدلا جائے گا،چنانچہ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

نیز ایک اور بات اسی لفظ ''أقربون'' نے یہ بتلائی کہ جس طرح مردوں کو مستحق وراثت سمجھا جاتا ہے اسی طرح عورتوں اور بچوں کو بھی اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا ،کیونکہ رشتہ اولاد کا ہو یا ماں باپ کا ،یا دوسری قسم کے رشتے ہوں ہر ایک میں رشتہ داری کی حیثیت لڑکے اورلڑکی میں یکساں ہے،جس طرح لڑکا ماں باپ سے پیدا ہوا ہے،اسی طرح لڑکی بھی انہی سے پیدا ہوئی ہے جب حق وراثت کا مدار رشتہ پر ہے تو چھوٹے بچے یا لڑکی کو محروم کرنے کے کوئی معنی نہیں رہتے ۔ (معارف القرآن،سورہ نساء،جلد۲،صفحہ۳۰۹)

اور جو لوگ نابالغ اولاد اور یتیم بچوں کو ان کا حق میراث نہیں دیتے بلکہ خود اس پر قابض ہو جاتے یا اپنے استعمال میں لے آتے ہیں،قرآن نے اس کے متعلق سخت وعید بیان فرمائی ہے،ارشاد خداوندی ہے:

''إِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ الْيَتَامٰى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا.'' (سورہ نساء،پ۴،آیت۱۰)

ترجمہ: بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ بس اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے ہیں اور عنقریب وہ دہکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔

اس آیت کے تفسیر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں:

بعض روایات میں ہے کہ یتیم کا مال ناحق کھانے والا قیامت کے روز اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ پیٹ کے اندر آگ کی لپٹیں اس کے منہ،ناک اور کانوں،آنکھوں سے نکل رہی ہوں گی۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں:

اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک قوم قیامت کے روز اس طرح اٹھائی جائے گی کہ ان کے منہ آگ سے بھڑک رہے ہوں گے،صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن میں نہیں پڑھا ''إن الذين يأكلون أموال.....الخ.''

''عن أبي برزة أن رسول الله ﷺ قال: يبعث يوم القيامة القوم من قبورهم تأجج أفواههم نارا، قيل: يا رسول الله! من هم؟ قال: ألم تر أن الله قال: إن الذين يأكلون أموال......الخ'' (تفسیر ابن کثیر،جلد اول،صفحہ۴۵۶)

آیت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہوا کہ یتیم کا مال جو ناحق کھایا جائے وہ درحقیقت جہنم کی آگ ہوگی،گو اس وقت اس کا آگ ہونا محسوس نہ ہو،اسی لئے رسول کریم ﷺ نے اس معاملہ میں شدید احتیاط کے لئے واضح ہدایات دی ہیں،حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: **''أحرّج مال الضّعيفين المرأة واليتيم.''**

''میں تم کو خاص طور پر دوضعیفوں کے مال سے بچنے کی تنبیہ کرتا ہوں ایک عورت اور دوسرے یتیم۔''

(تفسیر ابن کثیر،جلد اول،صفحہ۴۵۶،معارف القرآن،جلد دوم،صفحہ۳۱۵)

نیز یتیم کا مال کھانے والوں کے بارے میں صحیحین کی یہ روایت بھی ہے:

"عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ: اجتنبوا السبع الموبقات، قيل: يا رسول الله! وما هي؟ قال: الشرک بالله، والسحر، وقتل النفس التي حرم الله إلا بالحق، وأكل الربا، وأكل مال اليتيم، والتولي يوم الزحف، وقذف المحصنات المؤمنات الغافلات." (صحیح بخاری، کتاب الوصایا، حدیث ۲۷۶۶، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، حدیث ۲۶۳)

ترجمہ: رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا: سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو، صحابہ نے سوال کیا کہ وہ سات چیزیں کیا ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، جادو کرنا، ناحق کسی کا خون کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگنا اور بھولی بھالی پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا۔

استحقاق میراث کی بنیاد محض قرابت ہے نہ کہ خدمت وحاجت

اس موقع پر اس کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ قرآن پاک کی آیت "وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ" اور "مَا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ" سے فقہاء اور مفسرین نے یہ سمجھا اور بیان کیا ہے کہ:

وارثوں کے استحقاق میراث کی علت اور اس کی بنیاد خونی رشتہ اور قرابت داری ہے نہ کہ محض حاجت وخدمت اور دوسرے اسباب، مثال کے طور پر کسی شخص کا کوئی نافرمان بیٹا ہے، جس نے زندگی بھر اپنے باپ کی نافرمانی کی، نہ کبھی خدمت کی، اور نہ بیماری کے زمانہ میں کبھی قریب آیا، ساری خدمت، تیمارداری، تمام اخراجات وغیرہ دوسرے رشتہ داروں، بھائیوں وغیرہ نے برداشت کیے، تب بھی اس شخص کے مرنے کے بعد شرعی ضابطہ کے تحت وہ نافرمان بیٹا ہی اس کے مال کا وارث ہوگا، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ برسہا برس تک چونکہ اس کے بھائیوں نے خدمت کی ہے، لہٰذا ان کو اس کے مال کا وارث بنا دیا جائے۔

اسی طرح مثلاً کسی شخص کا انتقال ہوا اس کا ایک بیٹا نہایت غنی اور مالدار ہے جب کہ مرنے والے کا کوئی پوتا یا اس کی بہنیں سخت محتاج اور ضرورت مند ہیں، تو یہاں شرعی ضابطہ کے تحت یہ نہیں کیا جاسکتا کہ بیٹے کو اس کے غنی ہونے کی وجہ سے مال نہ دے کر اس کی پھوپھی یعنی مرنے والے کی بہنوں یا پوتوں نے محض ان کے فقر اور حاجت مند ہونے کی وجہ سے دے دیا جائے، اگر ایسا کیا جائے گا تو خلاف شرع اور ناجائز ہوگا، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس مسئلہ پر اچھی روشنی ڈالی ہے، تحریر فرماتے ہیں:

لفظ "أقربون" سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مال وراثت کی تقسیم ضرورت کے معیار سے نہیں بلکہ قرابت کے معیار سے ہے، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ رشتہ داروں میں جو زیادہ غریب اور حاجت مند ہو اس کو زیادہ وراثت کا مستحق سمجھا جائے، بلکہ جو میت کے ساتھ رشتہ میں قریب تر ہوگا، وہ بہ نسبت بعید کے زیادہ مستحق ہوگا، اگرچہ ضرورت اور حاجت بعید کو زیادہ ہو، اگر اقربیت کے ضابطہ کو چھوڑ کر بعض رشتہ داروں کے محتاج یا نافع ہونے کو معیار بنا لیا جائے تو نہ اس کا ضابطہ بن سکتا ہے، اور نہ یہ ایک طے شدہ مستحکم قانون کی شکل اختیار کرسکتا ہے، کیونکہ اقربیت کے علاوہ دوسرا معیار لامحالہ وقتی واجتہادی ہوگا، کیونکہ فقر وحاجت کوئی دائمی چیز نہیں، اس لئے کہ حالات بھی بدلتے رہتے ہیں درجات بھی، ایسی صورت میں استحقاق کے بہت سے دعوے دار نکل آیا کریں گے، اور فیصلہ کرنے والوں کو بھی اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہوگا۔ (معارف القرآن، جلد دوم، صفحہ ۳۱۱)

اس اعتراض کا علمی جائزہ کہ لڑکی کا حصہ لڑکے کے مقابلہ میں کم کیوں؟

اسلام کے دیئے ہوئے نظام میراث میں بعض معترضین کی طرف سے یہ اشکال کیا جاتا ہے کہ بیٹے کے مقابلہ میں بیٹی کو، بھائی کے مقابلہ میں بہن کو نصف حصہ ملتا ہے، یعنی لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دوگنا ملتا ہے، ایسا کیوں؟ اس کی وجہ کیا ہے؟

اس کا اصولی جواب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم وحکیم اور خالق و مالک ہے، اس نے اپنے بندوں کے لئے اپنی حکمت سے یہی حکم تجویز کیا ہے، بندوں کو اس پر ایمان لانا اور اس کے مطابق عمل کرنا بہر حال ضروری اور لازم ہے، اس میں چوں چرا کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں، اس کی حکمتوں کا احاطہ بندے نہیں کر سکتے۔

دوسرے لاکھوں کروڑوں بندوں کی لاکھوں کروڑوں عقلیں ہیں، اگر کسی بندہ کی عقل وفہم کے مطابق لڑکی اور لڑکے کے حصہ میں مساوات ہونا چاہئے، تو دوسرے عقلاء کے نزدیک لڑکے کے خصوصیات کی بناء پر اس کا دوگنا حصہ ہونا چاہئے، اب ہزاروں لاکھوں عقلوں میں سے کس کی عقل کو معیار قرار دیا جائے، اور کس کو ترجیح دی جائے، سیدھی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم وحکیم خالق و مالک اور شارع ہے، اس نے اپنے بندوں کے لئے جو بھی حکم مشروع کر دیا سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس کا ماننا اور اس کے مطابق عمل کرنا بندوں کے لئے ہر حال میں ضروری ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ اعتراض بھی علی الاطلاق صحیح نہیں کہ شریعت میں میراث میں لڑکیوں کا حصہ لڑکوں کے مقابلہ میں ہمیشہ آدھا ہی ہوتا ہے، بہت سے صورتوں میں لڑکا لڑکی، بھائی بہن کا حصہ برابر ہوتا ہے، بلکہ بعض صورتوں میں لڑکی کا حصہ لڑکے کے حصہ سے زیادہ بھی ہوجاتا ہے، جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

وہ صورتیں جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کا حصہ برابر ہے

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

جن حالات میں عورتوں کا حصہ مردوں کے برابر ہوتا ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱). میت نے ماں، باپ اور بیٹے کو چھوڑا ہو تو ماں اور باپ دونوں کو چھٹا حصہ ملے گا۔ (اس میں ماں اور باپ کا حصہ الگ الگ ہوگا)

(۲). اسی طرح اس نے اگر ماں، باپ اور دو بیٹیوں کو چھوڑا تب بھی ماں اور باپ دونوں کو چھٹا حصہ ملے گا، اور دو تہائی بیٹیوں کو ملے گا۔

(۳). اسی طرح اگر کسی عورت نے شوہر باپ، ماں اور ایک بیٹی کو چھوڑا تو اس صورت میں بھی ماں اور باپ چھٹے حصہ کے مستحق ہوں گے۔

(۴). ماں شریک بھائی، بہن کا حصہ بھی برابر ہوگا، جیسے ایک عورت نے شوہر، ماں اور ماں شریک بھائی کو چھوڑا تو ماں شریک بھائی چھٹے حصہ کا مستحق ہوگا، اگر شوہر اور ماں کے علاوہ صرف اخیافی بہن کو چھوڑا تو وہ بھی چھٹے حصہ کی ہی مستحق ہوگی۔

(۵). اسی طرح اگر کسی عورت کا انتقال ہوا اس کے ورثاء شوہر، ماں، اخیافی بھائی اور اخیافی بہن ہو تو نصف شوہر کا حصہ ہوگا، چھٹا حصہ ماں کا اور ایک تہائی میں بھائی اور بہن کا حصہ برابر ہوگا۔

(۶). بہت سی حالتیں ایسی ہیں کہ اگر مرنے والے کا ایک ہی وارث ہو، خواہ مرد ہو یا عورت، وہ پورے ترکہ کا حقدار قرار پاتا ہے، جیسے باپ، بیٹا، بھائی، شوہر، ماموں اور چچا، اسی طرح خاتون رشتہ داروں میں ماں، بیٹی، بہن، بیوی، خالہ اور پھوپھی۔

مثلاً اگر کسی شخص کے انتقال پر صرف اس کا ایک بیٹا ہی باقی بچا تو وہ پورے ترکہ کا حقدار ہوگا، اس لئے کہ وہ عصبہ ہے، اسی طرح اگر اس نے صرف بیٹی کو چھوڑا ہو تو وہ پورے ترکہ کی حقدار ہوگی، نصف تو اس کا متعینہ حصہ ہوگا، اور باقی نصف بھی شرعی ضابطہ کے تحت اس کو بطور ''رد'' کے ملے گا۔

(۷). بعض دفعہ حقیقی بہن اور حقیقی بھائی کا حصہ بھی برابر ہو جاتا ہے، جیسے ایک عورت نے شوہر اور ایک حقیقی بھائی کو چھوڑا تو نصف شوہر کا حق ہوگا، اور نصف بھائی کا، اسی طرح اگر شوہر اور حقیقی بہن کو چھوڑا تو نصف شوہر کا حصہ ہوگا، اور نصف حقیقی بہن کا، اور اگر اس نے شوہر اور حقیقی بھائی کے علاوہ ایک بیٹی کو بھی چھوڑا ہو تو شوہر چوتھائی ترکہ کا اور بیٹی نصف ترکہ کی مستحق ہوگی، باقی بھائی کا ہوگا، اگر یہاں حقیقی بھائی کے بجائے حقیقی بہن ہو تو باقی اس کو ملے گا۔

(۸). بلکہ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ حقیقی بھائی اور ماں شریک بہن کا حصہ برابر ہو جاتا ہے۔

مثلاً کسی عورت نے شوہر، ماں، ماں شریک بہن اور حقیقی بھائی کو چھوڑا ہو تو نصف ترکہ کا مستحق شوہر ہوگا، چھٹا حصہ ماں کو ملے گا، حقیقی بھائی اور اخیافی بہن دو چھٹے حصہ کے حقدار ہوں گے، حالانکہ رشتہ کے اعتبار سے یہ بھائی اس بہن سے زیادہ قریب ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں ورنہ بہت سی ایسی صورتیں بنتی ہیں جن میں عورت اپنے ہم درجہ مرد رشتہ دار سے زیادہ کی مستحق ہوتی ہے۔

وہ صورتیں جن میں لڑکی کا حصہ لڑکے سے بھی زائد ہوتا ہے

نیز حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی تحریر فرماتے ہیں:

بہت سی صورتوں میں عورتوں کا حصہ مردوں سے بڑھ جاتا ہے چند صورتیں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:

(۱). اگر کسی عورت کا انتقال ہوا اور اس نے شوہر، باپ، ماں اور دو بیٹیوں کو چھوڑا اور بالفرض اس کا ترکہ ساٹھ لاکھ روپے پر مشتمل ہو تو دونوں بیٹیوں کو بتیس لاکھ روپے فی کس سولہ لاکھ روپے ملیں گے، اور اگر اس نے شوہر باپ اور ماں کے علاوہ دو بیٹوں کو چھوڑا ہو تو وہ پچیس لاکھ یعنی فی کس ساڑھے بارہ لاکھ روپے کے حقدار ہوں گے۔

(۲). اسی طرح اگر کسی عورت کے ورثاء میں شوہر، ماں اور حقیقی بہنیں ہوں اور مثال کے طور پر اس کا ترکہ اڑتالیس لاکھ ہو تو دونوں بہنوں کو چوبیس یعنی فی کس بارہ لاکھ ملے گا، اور اسی صورت میں اگر دو بہنوں کے بجائے دو حقیقی بھائی ہوں تو ان کا حصہ سولہ لاکھ یعنی فی کس آٹھ لاکھ ہوگا، ان صورتوں میں عورت کا مقررہ حصہ دو تہائی اس حصہ سے بڑھ جاتا ہے، جو مرد کو بطور عصبہ حاصل ہوتا ہے۔

(۳). بعض صورتوں میں عورت نصف ترکہ کی مستحق ہوتی ہے، یہ اس کا مقررہ حصہ ہے جب کہ اس کے ہم درجہ مرد کا حصہ کم بنتا ہے، جیسے ایک عورت نے شوہر باپ ماں اور ایک بیٹی کو چھوڑا ہو تو اگر ترکہ ایک کروڑ چھپن لاکھ روپے پر مشتمل ہو تو بیٹی بہتر لاکھ کی مستحق ہوگی، اس صورت میں اگر بیٹی کی جگہ بیٹا ہو تو اس کا حصہ پینسٹھ لاکھ ہوگا۔

(۴). بعض دفعہ تو یہ فرق بہت زیادہ ہو جاتا ہے، جیسے کسی عورت کے ورثاء میں شوہر، ماں اور حقیقی بہن ہو اور فرض کیجئے کہ مرحومہ کا ترکہ اڑتالیس لاکھ ہو تو بہن کا حصہ اٹھارہ لاکھ ہوگا، اور اس صورت میں اگر بہن کے بجائے بھائی ہو تو اس کا حصہ صرف آٹھ لاکھ ہوگا۔

(۵). بعض دفعہ عورت کا مقررہ تہائی حصہ بھی اپنے مقابل مرد رشتہ دار سے زیادہ ہو جاتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نے بیوی، ماں، دو حقیقی بھائی اور دو ماں شریک بہنوں کو چھوڑا اور فرض کیجئے کہ مرنے والے کا ترکہ اڑتالیس لاکھ روپے تھا تو دونوں ماں شریک بہنوں کو سولہ لاکھ یعنی فی کس آٹھ لاکھ روپے ملیں گے، اور دونوں حقیقی بھائیوں کا حصہ بارہ لاکھ یعنی فی کس لاکھ ہوگا، اسی طرح اگر عورت نے شوہر، دو ماں شریک بہنوں اور دو حقیقی بھائیوں کو چھوڑا ہو اور مثلاً اس کا ترکہ ساٹھ لاکھ روپے ہو تو دونوں بہنوں کا حصہ بیس لاکھ ہوگا، اور دونوں بھائیوں کا دس لاکھ۔

(٦). بعض دفعہ خواتین کا مقررہ حصہ ترکہ کا چھٹا حصہ ہوتا ہے، لیکن وہ اس کے مقابل مرد رشتہ دار سے بڑھ جاتا ہے، جیسے ماں شریک بہن کا مقررہ حصہ چھٹا حصہ ہے، اب اگر کسی عورت نے شوہر ماں ایک ماں شریک بہن اور دو حقیقی بھائیوں کو چھوڑا ہو تو اگر ساٹھ

لاکھ ترکہ ہو تو بہن کو دس لاکھ ملے گا اور دو بھائیوں کو بھی دس لاکھ یعنی فی کس پانچ لاکھ ملے گا، اس طرح کی اور بھی متعدد صورتیں ہیں۔

وہ صورتیں جن میں صرف عورت ہی وارث بنتی ہے

آگے تحریر فرماتے ہیں:

بعض حالتیں ایسی ہیں کہ جن میں عورت وارث بنتی ہے، مرد وارث نہیں بنتا۔

جیسے ایک عورت نے، شوہر، باپ، ماں، بیٹی اور پوتی کو چھوڑا ہو تو پوتی چھٹے حصہ کی حقدار ہوگی، لیکن اس صورت میں اگر پوتی کے بجائے پوتا ہو تو اس کو کچھ نہیں ملے گا۔

اسی طرح اگر شوہر، حقیقی بہن اور باپ شریک بہن وارث ہو تو باپ شریک بہن چھٹے حصہ کی مستحق ہے، اور اگر اس کی جگہ باپ شریک بھائی ہو تو اس کو کچھ نہیں ملے گا، ان کے علاوہ بھی متعدد صورتیں ہیں جن میں خواتین حصہ پاتی ہیں اور ان کے مقابل مرد رشتہ دار حصہ نہیں پاتے۔ (خواتین کے مالی حقوق، صفحہ ۱۱ تا ۱۵)

البتہ عام حالات میں اکثر صورتوں میں شریعت کا حکم یہی ہے کہ "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" یعنی مؤنث کے مقابلہ میں مذکر یعنی لڑکی کے مقابلہ میں لڑکے کو اور بہن کے مقابلے میں بھائی کو دوگنا حصہ ملے گا، حکماء اسلام نے اس کی کچھ حکمتیں اور مصلحتیں بیان کی ہیں، جو آگے آرہی ہیں۔

ایک ضروری تنبیہ اور غلط فہمی کا ازالہ

اس موقع پر یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ میراث کے باب میں شریعت نے جن جن وارثوں کے جو بھی حصے متعین کئے ہیں ان سب کا دار و مدار اصلاً اوامر الٰہیہ اور ایسے نصوص قطعیہ پر ہے جس میں عقل و قیاس کی کوئی گنجائش نہیں، فقہاء و اصولیین ایسے اوامر کو "امر تعبدی" سے تعبیر کرتے ہیں، جس طرح نماز میں رکعتوں کی تعداد، زکوٰۃ میں نصاب وغیرہ میں کسی قسم کی کمی وبیشی کا امکان نہیں اسی طرح میراث کے حصوں اور وارثوں کی تعیین میں ہزار مصلحتوں اور علتوں کے نکالنے کے بعد بھی کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی، دنیا بھر کے عقلاء حکماء علماء وقانون ساز کمیٹیاں بھی مل کر میراث کے باب میں عقلی مصلحتوں اور حکمتوں کو بیان کر کے کسی وارث کے حصہ میں کمی وبیشی یا کسی نوع کی تبدیلی کرنا چاہیں تو شرعاً ان کو اس کا حق حاصل نہیں۔

ان سب کے باوجود حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی کتاب "المصالح العقلية للأحكام النقلية" میں اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے "حجة الله البالغة" میں وارثوں کے حصوں کی تعیین کی کچھ مصلحتیں اور حکمتیں بیان کی ہیں، مثلاً کسی وارث کو حصہ ملنے یا زائد ملنے میں اس کی خدمت یا ضرورت و احتیاج کا بھی تذکرہ کیا ہے، جس کی بنیاد پر شاید کوئی یہ کہنے لگے کہ جب اس کی بنیاد خدمت و حاجت پر ہے تو فلاں موقع میں فلاں رشتہ دار نے زیادہ خدمت کی تھی یا وہ زیادہ حاجت مند ہے، لہٰذا اس کو زیادہ حصہ ملنا چاہئے، اور فلاں اس وصف سے محروم ہے، لہٰذا اس کو میراث سے محروم کر دینا چاہئے، یا اس کا حصہ کم کر دینا چاہئے، ایسا کرنے کی کسی کو اجازت نہیں، باقی حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور دوسرے حضرات نے میراث کے باب میں اس نوع کی جن عقلی مصلحتوں و حکمتوں کا تذکرہ کیا ہے، ان کی حیثیت محض حکمت و مصلحت کی ہے نہ کہ علت کی، علت اور حکمت میں بڑا فرق ہے، احکام شرعیہ کا مدار شرعی علتوں پر ہوتا ہے نہ کہ محض مصلحتوں اور حکمتوں پر۔

مثال کے طور پر نماز و روزہ کی عقلی مصلحتیں اور اس کے کچھ روحانی و جسمانی فوائد بھی ہیں، مثلاً نماز پڑھنے سے تواضع پیدا ہوتی ہے، جسمانی ورزش بھی ہوتی ہے، نیز باجماعت نماز پڑھنے سے اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ ہوتا ہے، روزہ رکھنے سے قوت بہیمیہ کو

شکست ہوتی ہے، یعنی نفس مغلوب ہوتا ہے، صحت کے لئے بھی روزہ رکھنا مفید ہے، زکوٰۃ دینے سے بخل کا ازالہ ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ، اب اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ نماز وروزہ اور ادائیگی زکوٰۃ کے بغیر بھی اس کو یہ اوصاف حاصل ہیں، لہٰذا نماز وروزہ کی اس کو کوئی ضرورت نہیں، یا نماز وروزہ کرنے کے بعد بھی کسی کے اندر یہ اوصاف پیدا نہیں ہوئے لہٰذا اس کا نماز روزہ باطل ہوا، ایسا سمجھنا ہرگز صحیح نہیں، کیونکہ احکام شرعیہ کا مدار اسرار ومصالح پر نہیں ہے، بلکہ علل شرعیہ پر ہے، اس لئے میراث کے متعلق جن حکماء اسلام نے بھی وارثوں کے حصوں کی عقلی حکمتیں ومصلحتیں بیان فرمائی ہیں وہ ان کی علل نہیں ہیں کہ جن کے پائے یا نہ پائے جانے سے حکم میں فرق پڑے، اور اس کی وجہ سے ہم وارثوں کے حصص شرعیہ میں کچھ ترمیم کرنے لگیں، ایسا کرنے کی ہرگز کسی کو اجازت نہیں، البتہ حکماء امت اور علماء راسخین نے وارثوں کے حصوں کی جو حکمتیں اور مصلحتیں بیان کی ہیں وہ محض اس وجہ سے کہ ان احکام شرعیہ پر عمل کرنے میں مزید اطمینان وانشراح حاصل ہوجائے، نہ کہ اس وجہ سے کہ ان مصلحتوں کو علتوں کا درجہ دے کر احکام میراث میں کچھ تبدیلی کی جائے۔

اس تمہید کے بعد ان حکمتوں ومصلحتوں پر نظر کرنا چاہئے جن کو میراث کے باب میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہم نے بیان فرمایا ہے۔

میراث کے حصہ متعین ہونے اور لڑکی کے مقابلہ میں لڑکے کو دوگنا ملنے کی عقلی مصلحتیں وحکمتیں

شریعت مقدسہ میں جن وارثوں کے جو بھی حصے متعین کئے گئے ہیں اگرچہ ان سب کی حیثیت امر تعبدی کی ہے کہ بندوں کو اس میں محض اپنی عقل وقیاس کے ذریعہ ذرہ برابر بھی کسی نوع کی تبدیلی، کمی وبیشی کی گنجائش نہیں، لیکن اس کے باوجود تمام حکماء اسلام کا دعویٰ ہے کہ شریعت نے جس وارث کا جو بھی حصہ متعین کیا ہے وہ عین عقل وفطرت، عدل وانصاف اور حکمت ومصلحت کے مطابق ہے، جس کی تفصیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مطابق درج ذیل ہے:

شریعت نے میراث کے باب میں وارثوں کے مستحق یا محروم ہونے نیز کمی وبیشی کے ساتھ ان کے حصوں کے متعین ہونے کی بنیاد چار باتوں پر رکھی ہے:

(۱). عزت اور منصب میں مورث کی نیابت اور حمایت

(۲). خدمت ومحبت اور شفقت

(۳). صلہ رحمی اور قرابت

(۴). ضرورت وحاجت

یہ چار بنیادیں ہیں جن کی بناء پر شریعت نے وارثوں کو میراث کا مستحق بنایا ہے اور انہیں بنیادوں کی بناء پر ان کے میراث سے محروم ہونے نہ ہونے اور متعینہ حصوں میں کمی وبیشی کا فرق رکھا گیا ہے، میراث کے باب میں یہ چار بنیادیں ایسی ہیں جن کو حکماء اسلام نے قرآن پاک کی درج ذیل آیتوں سے سمجھا اور بیان کیا ہے، وہ آیتیں یہ ہیں:

(۱). "وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلَى بِبَعْضٍ." (سورہ انفال، پ۹، آیت ۷۵)

ترجمہ: رشتہ دار ایک دوسرے (سے میراث) کے زیادہ حقدار ہیں۔

(۲). "الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ." (سورہ نساء، پ۵، آیت ۳۴)

ترجمہ: مرد عورتوں پر نگراں ہیں اس لئے کہ اللہ ہی نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے، اور اس لئے کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

(۳). لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيباً مَّفْرُوضاً." (سورہ نساء، پ۵، آیت ۷)

ترجمہ: والدین اور قرابت داروں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے، اور والدین اور قرابت داروں کے متروکہ میں عورتوں کا بھی حصہ ہے، چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ مقرر کیا ہوا حصہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تصریح کے مطابق ان بنیادوں میں بھی سب سے زیادہ شریعت نے جس بات کا لحاظ کیا ہے، وہ قرابت اور خونی رشتہ ہے، اب ان بنیادوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے وارثوں کے مستحق یا محروم اور ان کے متعینہ حصوں کے تفاوت کو سمجھنا چاہیئے۔

(۱). استحقاق میراث کی ایک بنیاد عزت و مرتبہ اور منصب میں نیابت اور قائم مقام ہونا ہے، نیز مورث کے جاہ و منصب کی حمایت اور حفاظت کرنا بھی ہے، اور انسانی فطرت کے لحاظ سے سب سے زیادہ اس کے مستحق، ذمہ دار، فکرمند، دخیل اور موثر وہ رشتہ دار ہوتے ہیں جو اس کے عمود اور صلب نسب میں شمار ہوتے ہیں، جیسے باپ، بیٹا، دادا، پوتا اس کے بعد بھائی، بہن، چچا وغیرہ، شریعت نے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ترجیح بیٹے کو دی ہے، کیونکہ انسانی فطرت وطبیعت اور عرف وعادت کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو بیٹا ہی باپ کے قائم مقام اور اس کا نائب سمجھا جاتا ہے، سلیم الطبع انسان کی خواہش اور اس کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ عزت و منصب میں اس کا بیٹا اس کے قائم مقام رہے، اسی کے خاطر لوگ نکاح کرتے اور اولاد کی تمنا کرتے ہیں، باپ اپنے بیٹے کا قائم مقام اور اس کا نائب بنے، یہ بات انسانی فطرت کے خلاف ہے، البتہ بیٹے کا اپنے باپ کے قائم مقام ہونا اور اس کی گدّی سنبھالنا یہ فطرت و عادت کے مطابق ہے اور اس نیابت میں بیٹے سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوسکتا، بیٹی اور دوسرے رشتہ دار بھی ہوتے ہیں تو اس درجہ میں نہیں جس درجہ میں بیٹا ہوتا ہے۔

نیز باپ کی عزت اور اس کے منصب کی حمایت وحفاظت کی جو فکر بیٹے کو ہوتی ہے اور اس سلسلہ میں جو قربانی بیٹا دے سکتا ہے وہ بیٹی اور دوسرے رشتہ دار نہیں دے سکتے۔

نیز نسب اور خونی رشتہ میں بھی بیٹا اصل سمجھا جاتا ہے، کیونکہ خاندانی نسب اسی سے آگے چلتا ہے، شریعت نے بھی نسب میں باپ بیٹے کا اعتبار کیا ہے، اور ہر زمانہ میں عرف و عادت بھی یہی رہی ہے کہ کسی شخص کا سلسلہ نسب بیٹے سے چلتا ہے، بیٹی اور دوسرے رشتہ داروں سے نہیں، یعنی قرابت اور سلسلہ نسب چلنے میں بیٹے کے برابر کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح ضرورت وحاجت کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو بیٹے پر خود اس کی اور اس کی بیوی اور اولاد کے نفقہ کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے، اس کے برخلاف بیٹی جب تک غیر شادی شدہ ہے اس کا نفقہ باپ پر لازم ہے، شادی ہوجانے کے بعد اس کے نفقہ کی ذمہ داری اس کے شوہر پر عائد ہوتی ہے، اس کے اولاد کے نفقہ کی ذمہ داری بھی اس کے شوہر پر ہوتی ہے، بیوی پر نہیں، ان تمام وجوہات کی بناء پر شریعت نے میراث کا سب سے زیادہ مستحق بیٹے کو قرار دیا ہے، بیٹی میں مذکورہ بالا مصلحتیں و حکمتیں بیٹے کے مقابلہ میں کم درجہ میں پائی جاتی ہیں، کیونکہ باپ کا سلسلہ نسب اس سے نہیں چلتا، نیز بیٹے کی طرح بیٹی تمام امور میں اپنے باپ کی نیابت اور اس کی عزت و منصب کی حفاظت وحمایت بھی نہیں کرسکتی، ضرورت وحاجت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بیٹی کے مقابلہ میں بیٹے کی ضرورتیں وحاجتیں اس سے کہیں زائد ہیں اس لئے شریعت نے میراث میں بیٹی کے مقابلہ میں بیٹے کا حصہ دوگنا اور بیٹی کا بیٹے سے نصف رکھا ہے۔

یہ صرف ایک مثال ہے اسی طرح تمام ورثاء کے حصوں کو فرداً فرداً مذکورہ بالا چاروں بنیادوں کو سامنے رکھتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو شریعت نے جس جس وارث کا جس صورت میں جتنا حصہ متعین کیا ہے یا کسی وارث کا حصہ کم کیا یا بالکل محروم کیا ہے وہ بلا شبہ عقل وفطرت اور انصاف کے مطابق ہے۔

دوسری مثال

اس کی ایک مثال اور لیجئے:

استحقاق میراث کا ایک سبب خدمت ومحبت اور شفقت بھی ہے، اور یہ سبب ماں، بیوی اور بیٹی میں بہ نسبت دوسرے رشتہ داروں کے زیادہ پایا جاتا ہے، اس لئے شریعت نے ماں بیوی اور بیٹی کو تو ہر حال میں وارث بنایا ہے، چنانچہ کسی صورت میں وہ محروم نہیں ہوتیں، پھر ان تینوں میں سب سے زیادہ شفقت ومحبت اور ہمدردی بندہ کو اپنی ماں سے حاصل ہوتی ہے، اس کے بعد بیوی سے، اس لئے شریعت نے ماں کا حصہ بیوی سے زائد ثلث (ایک تہائی) اور مورث کے اولاد ہونے کی صورت میں سدس (چھٹواں حصہ) رکھا ہے، اور بیوی کا حصہ ربع (ایک چوتھائی) اور اولاد ہونے کی صورت میں ثمن (آٹھواں حصہ) مقرر کیا ہے، اور بیٹی کے اندر بھی شفقت و ہمدردی دوسرے رشتہ داروں سے زیادہ ہوتی ہے، نیز باپ کی نسبت سے کسی درجہ میں وہ بھی اپنے باپ کی نیابت و حمایت کرتی ہے، لیکن بیٹے سے کم، اس لئے شریعت نے ماں اور بیوی سے زیادہ بیٹی کا حصہ متعین کیا ہے، یعنی بعض صورتوں میں نصف اور بعض صورتوں میں ثلثان (یعنی دوتہائی)، لیکن بیٹے کے مقابلہ میں بیٹی کا آدھا رکھا ہے، کیونکہ بیٹے کی طرح بیٹی نیابت و حمایت کے فرائض انجام نہیں دے سکتی۔ واللہ اعلم۔

اسی طرح دوسرے وارثوں کو سمجھنا چاہئے مثلاً مرنے والے کی بہنیں کہ ان کے اندر بھی میت کی طرف سے غم خواری، شفقت ومحبت کا عنصر پایا جاتا ہے، لیکن بیٹے، بیٹی، ماں اور بیوی سے کم، اس لئے بعض صورتوں میں ان کا حصہ کم ہوتا ہے، اور بعض صورتوں میں یہ محروم بھی ہوجاتی ہیں، جس کی تفصیل کتب میراث میں موجود ہے۔

اسی طرح اور دوسرے ورثاء کو اگر دیکھا جائے تو ان کے حصوں کی کمی اور محرومی انہیں چار بنیادوں کی بناء پر ہوگی، اگر کسی وارث میں بظاہر اس کے خلاف بھی ہو تو وہ یا تو کسی عارض کے سبب ہوگا یا بعض حالات میں اس وارث کی کسی خصوصیت کی بناء پر ہوگا، جو اس کے اندر پائی جاتی ہے۔

الغرض شریعت مقدسہ میں کسی بھی وارث کا حصہ کم یا زیادہ ہونا یا اس کا بالکل محروم ہونا بے معنی اور بلا وجہ نہیں بلکہ نہایت معقول اور صحیح بنیادوں پر ہے، کسی سلیم الطبع کامل العقل کے نزدیک اس سے بہتر کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

یہ خلاصہ ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بیان کا۔

ایک بڑا مغالطہ اور اس کا جواب

ہوسکتا ہے کسی عقل مند کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب میراث کی بنیاد ان چار امور پر ہے، یعنی عزت ومنصب میں نیابت، یا خدمت وشفقت وغیر ذلک، تو اگر کوئی قریبی وارث بھی مثلاً بیٹا یا بیوی ان صفات سے خالی ہوں جن کی بنیاد پر میراث کا استحقاق ہوتا ہے تو کیا ایسی صورت میں بھی بیٹے یا بیوی کو وراثت کا استحقاق ہوگا؟ عقل کا تقاضا تو یہی ہے کہ جب کوئی وارث استحقاق میراث کی ان بنیادی صفات سے خالی ہو تو اس کو میراث سے محروم ہونا چاہئے، جب کہ شریعت ہر صورت میں وارث بناتی ہے، ایسا کیوں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ماقبل میں یہ بات عرض کی جاچکی ہے کہ استحقاق میراث کا اصل سبب تو قرابت داری یعنی خونی رشتہ ہونا ہے، باقی اوصاف جو حکماء اسلام نے بیان کئے ہیں، ان کی حیثیت علت کی نہیں ہے جس کے پائے جانے نہ پائے جانے سے اصل حکم میں فرق پڑتا ہے، بلکہ ان کی حیثیت محض مصلحت وحکمت اور نکتہ کی سی ہے کہ ان کے وجود وعدم سے نفس حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ اب نفس قرابت ورشتہ داری ہی علت وسبب کے قائم مقام ہے، لہٰذا اب حکم کا مدار محض قرابت کی بناء پر ہوگا، ان

اوصاف واسباب کی بناء پر نہ ہوگا۔

دینی مثالوں میں اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حالت سفر میں قصر صلوٰۃ یعنی بجائے چار رکعت کے دو رکعت پڑھنے کا حکم ہے، اور اصولیین کی تصریح کے مطابق اصل علت تو اس کی مشقت ہے، لیکن مشقت کا ہونا نہ ہونا یہ اعتباری امر ہے اور اس کا فیصلہ دشوار تر ہے کہ سفر میں مشقت ہے یا نہیں، کسی کو ہے کسی کو نہیں، کبھی ہے کبھی نہیں، ایک ہی سفر ایک شخص کے لئے پُر مشقت ہے تو دوسرے کے لئے وہی سفر بے مشقت اور نہایت آرام دہ، اس لئے شریعت نے قصر صلوٰۃ کے لئے نفس سفر ہی کو مشقت کے قائم مقام کر دیا، اب خواہ سفر میں مشقت ہو یا نہ ہو، اگر سفر شرعی ہوگا تو قصر صلوٰۃ کا حکم بھی ہوگا، گو مشقت بالکل ہی نہ ہو، اور اگر سفر شرعی مسافت سے کم کا ہے تو قصر صلوٰۃ کا حکم نہیں ہوگا گو مشقت بہت زیادہ ہو۔

اسی طرح میراث کے مسئلہ کو سمجھنا چاہیئے کہ بیٹا بیوی وغیرہ کے استحقاق میراث کا اصل سبب تو عزت و مرتبہ اور منصب میں نیابت اور خدمت و شفقت وغیرہ اسباب ہیں، لیکن اس کا فیصلہ کرنا کہ واقعی یہ وارث ان صفات سے متصف ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس درجہ کا ہے، اس کا کوئی پیمانہ اور معیار مقرر کرنا دشوار تر اور انتشار و اختلاف کا باعث تھا، اس لئے شریعت نے ان اسباب و اوصاف کا اعتبار نہ کرکے نفس قرابت اور خونی رشتہ کو ان اوصاف و اسباب کے قائم مقام کر دیا، لہٰذا اب میراث کا حکم اور اس کے حصوں کا استحقاق قرابت کی بناء پر ہوگا، نہ کہ اوصاف کی بناء پر، لہٰذا ایک بیٹا اپنے باپ کا وارث ہوگا، خواہ وہ کتنا ہی ناکارہ اور نافرمان ہو، جیسے حالت سفر میں قصر صلوٰۃ کا حکم ہوگا خواہ سفر کتنا ہی آرام دہ اور مشقت سے خالی ہو، جس طرح قصر صلوٰۃ میں نفس سفر کو مشقت کے قائم مقام کرکے حکم کو اس سے مربوط کیا گیا، اسی طرح باب میراث میں نفس قرابت کو ان اوصاف کے قائم مقام کرکے حکم کو اس سے مربوط کیا گیا۔

دنیاوی مثالوں میں اس کی مثال یہ سمجھنا چاہیئے کہ ٹرینوں کے ذریعہ سفر کرنے میں سب جانتے ہیں کہ بعض ٹرینیں نہایت تیز رفتار سپر فاسٹ ہوتی ہیں، اس وجہ سے ان کا کرایہ بھی زیادہ ہوتا ہے، مثلاً ہمارے دیار میں شتابدی، گومتی وغیرہ، اس کے مقابلہ میں دوسری ٹرینیں پیسنجر وغیرہ سست رفتار منزل مقصود تک دیر میں پہنچاتی ہیں، اس لئے ان کا کرایہ بہت کم ہوتا ہے، اب فرض کیجئے کہ کوئی سپر فاسٹ ٹرین لیٹ ہو جائے یا کسی وجہ سے منزل مقصود تک بہت تاخیر سے پہنچائے اور اس کے مقابلہ میں پیسنجر جلد پہنچا دے تو کیا سپر فاسٹ کے مسافر کو دنیا کے عقلاء و وکلاء اس بات کا حق دیتے ہیں کہ سپر فاسٹ ٹرین کا اصل وصف جلدی پہنچنا ہے، اس وصف کے نہ پائے جانے کی وجہ سے تمام مسافرین کا کرایہ پیسنجر کے برابر ہونا چاہیئے، اور جو زائد کرایہ لیا گیا ہے وہ واپس ہونا چاہیئے، آج تک ایسا مطالبہ کسی عقل مند نے نہیں کیا ہوگا، ایسا کیوں؟ اسی لئے کہ سپر فاسٹ کے کرایہ کی زیادتی کی علت اگرچہ اس کا تیز رفتار ہونا اور منزل مقصود تک جلد پہنچانا تھا، لیکن تیز رفتار یا سست رفتار ہونا ظنی امر ہے، مختلف احوال و عوارض کی بناء پر اس میں تخلف اور تقدیم و تاخیر بھی ممکن ہے، لہٰذا اب نفس ٹرین ہی کو اس وصف کے قائم مقام کر دیا گیا، لہٰذا کرایہ کی زیادتی کے حکم کا مدار اب نفس ٹرین ہی سے مربوط ہوگا، خواہ وہ وصف پایا جائے یا نہ پایا جائے، ٹرین جلدی پہنچائے یا تاخیر سے، کرایہ بہر حال اکسپریس کا ہی دینا ہوگا، کیونکہ نفس ٹرین ہی کو اس وصف کے قائم مقام کر دیا گیا ہے، اسی طرح میراث کے باب میں بھی ورثاء کے جو حصے شریعت نے متعین کئے ہیں وہ اگرچہ خاص اوصاف و اسباب کی بناء پر ہیں، لیکن ان اوصاف کے پائے جانے یا نہ پائے جانے کا فیصلہ بہت دشوار تھا، اس لئے نفس قرابت اور رشتہ داری ہی کو ان اوصاف و اسباب کے قائم مقام کر دیا گیا، اس لئے اب اس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ بیٹا اگر نافرمان اور اس درجہ ناکارہ ہو کہ باپ کی نیابت کی اس کے اندر قطعاً اہلیت نہ ہو پھر بھی اس کو سب سے بڑا وارث اور مستحق میراث کیوں سمجھا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

دور کے رشتہ دار جو قریبی رشتہ داروں کی وجہ سے میراث سے محروم ہو گئے ہوں ان کے متعلق میراث پانے والوں کے لئے شریعت کی ضروری ہدایات

شریعت نے استحقاق میراث کے سلسلہ میں جو ضابطہ بیان کیا ہے اس کی بنیاد چونکہ قرابت ورشتہ داری ہے، اور اس میں بھی قریبی رشتہ داروں کو دور کے رشتہ داروں پر ترجیح دی گئی ہے، آیت "و الأقربون" سے فقہاءِ اسلام نے "الأقرب فالأقرب" کا ضابطہ بیان کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اقرب یعنی قریبی رشتہ دار کے ہوتے ہوئے ابعد یعنی دور کے رشتہ دار کو میراث سے حصہ نہیں ملے گا، مثلاً مرنے والے کے باپ کے ہوتے ہوئے اس کے دادا کو میراث میں حصہ نہیں ملے گا، اور بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کو حصہ نہیں ملے گا، نیز بیٹے کے ہوتے ہوئے مرنے والے کے بھائی بہنیں بھی محروم ہوں گی۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''جب وراثت کا مدار رشتہ داری پر ہو تو اصول یہ بنایا جائے کہ اگر نزدیک و دور کے مختلف رشتہ دار جمع ہوں تو قریبی رشتہ دار کو بعید پر ترجیح دے کر اقرب کے ہوئے تو ابعد کو حصہ نہ دیا جائے، ہاں اگر کچھ رشتہ دار ایسے ہوں جو بیک وقت سب کے سب اقرب قرار دیئے جائیں اگرچہ وجوہ اقربیت ان میں مختلف ہوں تو پھر یہ سب مستحق وراثت ہوں گے، جیسے اولاد کے ساتھ ماں باپ یا بیوی وغیرہ، کہ یہ سب اقرب ہیں، اگرچہ اقربیت کی وجوہ مختلف ہیں۔'' (معارف القرآن، سورہ نساء، جلد ۲، صفحہ ۳۱۱)

لیکن جب قریبی وارثوں کو ان کا شرعی حصہ دیا جائے گا، تو دور کے رشتہ داروں کا بھی چونکہ میت سے خونی رشتہ ہے اس لئے میت کے مال سے دوسروں کو ملتا ہوا حصہ دیکھ کر طبعی طور پر ان کو کافی ملال ہوگا، دور کا رشتہ ہونے کی وجہ سے حصہ نہ ملنے سے ان کا دل افسردہ اور رنجیدہ ہوگا اور وہ حسرت بھری نگاہوں سے اس کو دیکھیں گے، اس لئے حق تعالیٰ نے ایسے موقع کے لئے ہدایت دی ہے:

''وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُوْلُواْ الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُواْ لَهُمْ قَوْلاً مَّعْرُوفاً.''
(سورہ نساء، پ۴، آیت ۸)

ترجمہ: اور جب تقسیم کے وقت خویش واقارب، یتیم اور محتاج بھی موجود ہوں تو ان میں سے کچھ ان کو بھی دے دو، اور (نہ دے سکو تو) ان سے بھلی بات کہو۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں:

یعنی جو دور کے رشتہ دار اور یتیم مسکین میراث میں حصہ پانے سے محروم ہو رہے ہوں، اگر وہ تقسیم میراث کے وقت آموجود ہوں تو میراث پانے والوں کا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس مال میں سے باختیار خود کچھ حصہ ان کو بھی دے دیں جو ان کے لئے ایک قسم کا صدقہ اور موجب ثواب ہے، اور ایسے وقت میں جب کہ ایک مال بغیر کسی سعی وعمل کے محض خدا تعالیٰ کے دین سے انہیں مل رہا ہو تو صدقہ خیرات فی سبیل اللہ کا خود بھی داعیہ دل میں ہونا چاہئے، جیسا کہ اس کی ایک نظیر دوسری آیت میں مذکور ہے: ''كُلُواْ مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُواْ حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ.'' (سورہ انعام، پ۸، آیت ۱۴۱) یعنی اپنے باغ کے پھل کھاؤ جب کہ وہ پھل دینے لگے، اور جس روز پھل کاٹو تو اس کا حق نکال کر فقراء ومساکین کو دے دو۔

خلاصہ یہ کہ میراث کی تقسیم کے وقت اگر کچھ دور کے رشتہ دار یتیم مسکین وغیرہ جمع ہو جائیں جن کا کوئی حصہ ضابطہ شرعی سے اس میراث میں نہیں ہے تو ان کے جمع ہو جانے سے تم تنگ دل نہ ہو، بلکہ جو مال خدا تعالیٰ نے تمہیں بلا محنت عطا فرمایا ہے اس میں سے بطور شکرانہ کچھ عطا کر دو، اور غنیمت جانو کہ خرچ کا ایک اچھا موقع مل رہا ہے، اس موقع پر ان لوگوں کو کچھ دے دینے سے ان دور

کے رشتہ داروں کی دل شکنی اور حسرت کا ازالہ ہو جائے گا، اس میں مرنے والے کا محروم الارث پوتا بھی آ گیا، اس کے چچاؤں اور پھوپھیوں کو چاہئے کہ اس کو اپنے اپنے حصہ سے بخوشی کچھ دے دیں۔

آخر آیت میں فرمایا: "وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلاً مَّعْرُوفًا" اگر یہ لوگ اس طرح تھوڑا سا دینے پر بھی راضی نہ ہوں بلکہ دوسروں کے برابر حصہ کا مطالبہ کرنے لگیں تو چونکہ ان کا یہ مطالبہ قانون شرع کے خلاف اور غیر منصفانہ ہے اس لئے ان کا مطالبہ پورا کرنے کی گنجائش نہیں، لیکن اس پر بھی ان کو کوئی ایسی بات نہ کہی جائے جس سے ان کی دل شکنی ہو بلکہ معقول طور پر ان کو سمجھا دیا جائے کہ شرعی قاعدہ سے میراث میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے، ہم نے جو کچھ دیا ہے وہ محض تبرعاً دیا ہے، اور ایک بات یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ ان لوگوں کو تبرعاً جو دیا جائے گا مجموعی مال میں سے نہیں، بلکہ بالغین ورثاء میں سے جو ہوں وہ اپنے حصہ میں سے دیں، نابالغ اور غائب کے حصہ میں سے دینا درست نہیں۔ (معارف القرآن، سورہ نساء، جلد۲، صفحہ ۳۱۳، ۳۱۴)

تقسیم میراث سے پہلے کرنے کے تین کام

اتنی بات تو معمولی درجہ کا پڑھا لکھا آدمی بھی جانتا ہے کہ مورث کے انتقال کے بعد سب سے پہلا خرچہ جو مورث کے ترکہ سے کیا جائے گا وہ اس کی تجہیز و تکفین اور تدفین کا ہے، اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ اگر اس پر کوئی قرض آتا ہو خواہ وہ بیوی کا مہر ہی کیوں نہ ہو، شرعی حکم کے تحت تجہیز و تکفین کے بعد سب سے پہلے اس کا قرض ادا کیا جائے گا، شریعت میں اس کی اس درجہ اہمیت ہے کہ مقروض میت کی رسول اللہ ﷺ نے نماز جنازہ نہیں پڑھائی اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"صلّوا علی صاحبکم." (صحیح بخاری، کتاب الحوالات، باب إن أحال دین المیت علی رجل جاز، حدیث ۲۲۸۹)

تم لوگ اس کے جنازہ کی نماز پڑھ لو میں نہیں پڑھاؤں گا محض اس وجہ سے کہ وہ مقروض مرا ہے، اور اتنا ترکہ اس نے چھوڑا نہیں کہ جس سے اس کا قرض ادا ہو جائے۔

البتہ جب فتوحات کا دروازہ کھل گیا، اور آپ کے پاس گنجائش ہوگئی تو آپ خود میت کا قرض ادا فرماتے تھے، اور جنازہ کی نماز ادا فرماتے۔

"عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ أن رسول الله ﷺ کان یؤتی بالرجل المتوفی علیه الدین، فیسأل: هل ترک لدینه فضلا؟ فإن حدث أنه ترک لدینه وفاءً صلی، وإلا قال للمسلمین: صلوا علی صاحبکم، فلما فتح الله علیه الفتوح قال: أنا أولیٰ بالمؤمنین من أنفسهم، فمن توفی من المؤمنین فترک دیناً فعلي قضائه، ومن ترک مالاً فلورثته."

(صحیح بخاری، کتاب الکفالة، باب الدین، حدیث ۲۲۹۸)

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: میت (خواہ کتنا ہی صالح اور دین دار ہو) اگر مقروض ہو کر مرا ہے تو اس کی روح معلق رہتی ہے، یعنی نیک ارواح میں اس کو اس وقت شامل نہیں کیا جاتا جب تک کہ اس کا قرض ادا نہ کر دیا جائے۔

"عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ أنه قال: نفس المؤمن معلقة بدینه حتی یقضی عنه."

(جامع الترمذی، أبواب الجنائز، حدیث ۱۰۷۸)

اس لئے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ میت کے ترکہ سے سب سے پہلے اس کا قرض ادا کیا جائے اگر چہ اس میں ترکہ کا سارا مال ختم ہو جائے۔ (درمختار شامی وغیرہ)

ادائے قرض کے بعد تیسرے درجہ میں اس کی جائز وصیتوں کو پورا کرنے کا نمبر آتا ہے، اگر میت نے کوئی جائز وصیت کی تھی تو شرعی حکم کے مطابق صرف اور صرف تہائی مال میں سے اس کی وصیت کو نافذ کیا جائے گا، خواہ وہ وصیت کسی نیک کام مثلاً تعمیر مسجد و

مدرسہ میں مال خرچ کرنے کی ہو یا کسی اجنبی یا رشتہ دار کو دینے کی وصیت ہو، تہائی مال سے اس کا پورا کرنا وارثوں پر ضروری ہے، البتہ اگر رشتہ داروں میں کسی ایسے رشتہ دار کے لئے وصیت کی ہے جس کا میراث میں کچھ حصہ بھی بنتا ہو تو ایسے وارث کے لئے بھی وصیت کرنا ناجائز ہے، اور اس وصیت کو پورا کرنا بھی ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لا وصية لوارث." (جامع الترمذي، أبواب الوصايا، باب ما جاء لا وصية لوارث، حديث ۲۱۲۰)

"کسی وارث کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں۔"

مثلاً مورث نے وصیت کی میرا اتنا مال یا فلاں جائداد و مکان میرے فلاں بیٹے، بیٹی کو یا بیوی دے دیا جائے، تو چونکہ شرعاً یہ وارث ہیں اس لئے ایسی وصیت کرنا ناجائز اور اس کے مطابق عمل کرنا بھی حرام ہے، الا یہ کہ تمام ورثاء بخوشی اس کی اجازت دے دیں تو یہ ان کا تبرع اور احسان ہوگا، اور نابالغ کی اجازت کا کوئی اعتبار نہیں، البتہ اگر اپنی زندگی میں ہبہ کے طور پر کسی کو مالک بنا دیا تو اس کا مسئلہ اس سے مختلف ہے، ایسی صورت میں وہ مالک بن جائے گا۔

الغرض ترکہ کے مال میں تیسرے نمبر پر جائز طریقہ سے اس کی وصیت کو پورا کرنا ہے، وصیت کو نافذ کرنے کے بعد چوتھے نمبر پر اب جتنا مال بچا ہے وہ سب وارثوں کا حق ہے، شریعت کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق اس کا ترکہ وارثوں کے درمیان تقسیم کرنا ضروری ہے۔

ضرورت اور مصلحت کی بنا پر وارثوں کے لئے جائز طریقہ سے وصیت کرنے کا طریقہ

کتاب وسنت کی ہدایت کے مطابق کسی وارث کے لئے حقیقت میں وصیت کرنا تو جائز نہیں، لیکن قانونی مصلحت سے یا مورث کے اس خطرہ اور اندیشہ کی وجہ سے کہ میرے مرنے کے بعد کمزور وارث مثلاً بیٹی اور نابالغ اولاد میراث سے اپنا حصہ نہیں پاسکیں گے، ایسی صورت میں اپنے کمزور وارثوں کو ضرر وظلم سے بچانے نیز وارثوں کے درمیان انتشار واختلاف سے حفاظت کے لئے مورث اگر اپنے وارثوں کے لئے وصیت نامہ مرتب کرتا ہے اور اپنی اس وصیت میں ہر وارث کے لئے اس کے شرعی حصہ کے مطابق (جو اس کو میراث میں ملنا ہے) وصیت کرتا اور قانونی مضبوطی کرتا ہے تو یہ نہ صرف جائز بلکہ بہتر اور پسندیدہ ہے، شرط اس میں یہی ہے کہ جملہ وارثوں میں جس وارث کے لئے مورث نے جتنے مال کی وصیت کی ہے وہ اس کے میراث کے شرعی حصہ سے نہ کم ہو نہ زائد، اس طرح وصیت کرنا وارثوں کے لئے بھی جائز بلکہ آج کے حالات میں مناسب اور بہتر ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ اپنے فتاوی میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگر مورث (یعنی مرنے والا شخص) اپنے ترکہ میں اس طرح وصیت کر جائے کہ فلاں وارث کو فلاں چیز دی جائے اور فلاں وارث کو فلاں چیز، بشرطیکہ وہ اس کے شرعی حصہ سے کم نہ ہو تو جائز ہے، اور اگر کم ہو تو ناجائز ہے، کیونکہ اس میں وارث کے لئے وصیت ہے جو کہ ناجائز ہے۔

اور مذکورہ طریقہ کے مطابق حصوں کو متعین کر دینا یہ (بھی ایک طرح کی) تقسیم ہے، اور اس کا اختیار مورث کو دیا گیا ہے، اس لئے والد صاحب کو مثلاً ایسا کرنا چاہئے کہ سب وارثوں کے لئے ان کے شرعی حقوق کے موافق الگ الگ ایسے قرعے بنا کر کہ لڑکیوں کے ساتھ لڑکوں کی شرکت نہ ہو وصیت لکھ دیں کہ اس کے موافق تقسیم ہو۔ (امداد الفتاوی ص ۳۴۷، جلد ۴)

ضروری تنبیہ

اس موقع پر ایک بڑی غلطی لوگ یہ کرتے ہیں کہ میت کے ادائے قرض یا تنفیذ وصیت کی تو فکر کرتے نہیں البتہ ترکہ کے مال سے ایصال ثواب، قرآن خوانی، تیجہ، چالیسواں وغیرہ کا اہتمام کرتے ہیں، جس میں خاندان و برادری کے لوگوں کو جمع کر کے دعوت بھی ہوتی ہے، تو یاد رکھنا چاہئے کہ اگر میت کے مال یعنی ترکہ سے اس کے لئے ایصال ثواب کا اہتمام کیا جائے مثلاً میت کی طرف سے حج یا عمرہ کرایا جائے تو یہ بھی ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ اس میں وارثوں کا حق ہے، الّا یہ کہ تمام ورثاء خوشی سے راضی ہوں، دلی رضامندی شرط ہے، محض مروت وشرما حضوری کی اجازت کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں، اسی طرح نابالغ وارث کی اجازت کا بھی کوئی اعتبار نہیں، اس لئے بہتر صورت یہی ہے کہ میراث کو تقسیم کر دیا جائے پھر اپنی مرضی سے جس کا جتنا جی چاہے، اپنے طور پر میت کے لئے ایصال ثواب کر دے۔ واللہ اعلم۔

اور رسم و رواج کے مطابق ایصال ثواب کے غیر مشروع اور غلط طریقے اختیار کرنا تو بالکل ہی ناجائز ہے، تیجہ چالیسواں وغیرہ میں جو کھانا پکنے اور کھلانے کا اہتمام ہوتا ہے وہ عموماً تقسیم میراث کے بغیر ترکہ کے مال سے ہوتا ہے اس کا کھلانا اور کھانا سب حرام ہے، یتیموں کو ان کا حصہ نہ دے کر خود کھانے اور کھلانے کو قرآن نے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھرنے سے تعبیر کیا ہے، ایسے لوگ دوزخ میں جائیں گے، ارشاد ہے:

”إِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ الْيَتَامٰى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا۔“

(سورہ نساء، پ۴، آیت ۱۰)

ترجمہ: بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ بس اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے ہیں اور عنقریب وہ دہکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔

تقسیم میراث کے عمل کو انجام دینے کے لئے تین کاموں کی ضرورت

تجہیز و تکفین اور ادائے قرض و تنفیذ وصیت کے بعد چوتھے نمبر پر میت کا متروکہ مال اس کے تمام وارثوں کے درمیان تقسیم کرنا ضروری ہے، عملی طور پر اس کام کو انجام دینے کے لئے تین باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا مرحلہ

سب سے پہلے مرنے والے کے قریبی اور دور کے تمام رشتہ داروں مثلاً ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، بھائی، بہن، بیوی، دادا، دادی، چچا وغیرہ میں جو موجود ہوں ان سب کی تفصیل لکھی جائے اور اس پہلے مرحلہ میں موجود ورثاء کے درمیان شرعی طور پر سب کا حصہ متعین کیا جائے کہ مورث کے ترکہ سے کس وارث کو کتنا حصہ ملے گا، مثلاً نصف، ربع، ثمن، ثلثان، ثلث، سدس، ان حصوں میں کس وارث کا کتنا حصہ ہے اور کون محروم ہے، یہ پہلا مرحلہ ہوا، جس میں حصہ پانے والے موجود ہر وارث کے حصہ کی تعیین کی جائے گی۔

دوسرا مرحلہ

حصوں کی تعیین کے بعد دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ان حصہ پانے والے ورثاء میں اگر کوئی وارث اپنے حصہ کو خوش دلی سے نہیں لینا

چاہتا، یا اپنے حصہ سے مستغنی ہو کر کسی اور رشتہ دار کو یا جملہ ورثاء کو اپنا حصہ دینے کو تیار ہے تو اس کی ہدایت کے مطابق عمل کیا جائے گا،

اس دوسرے مرحلہ میں بسا اوقات یہ صورت پیش آتی ہے کہ جملہ ورثاء میں سے کوئی وارث یہ کہتا ہے کہ میت کے ترکہ کا فلاں فلاں مال میرے قبضہ میں ہے یا فلاں زیور و جائداد میرے پاس موجود ہے جو میرے میراث کے حصہ سے بہت کم ہے، لیکن میں اتنے ہی حصہ لینے پر اکتفاء کرتا ہوں اس کے علاوہ مجھ کو کچھ نہیں چاہئے، یعنی ترکہ کے ایک حصہ کو لے کر باقی حصہ سے دست بردار ہو کر وہ مصالحت کرنا چاہتا ہے، سو اس مصالحت کی صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں، بعض صورتیں جائز ہیں اور بعض ناجائز، بعض میں مبادلہ کرنے سے سود بھی لازم آتا ہے، فقہاء نے اس نوع کی صورتوں کو ''کتاب الصلح'' میں تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صلح کی بعض شکلیں جائز ہیں، اور بعض ناجائز، اس لئے مناسب صورت یہ ہے کہ مصالحت کی جو صورت بھی عمل میں لائی جائے اس کی تفصیل لکھ کر دارالافتاء سے فتویٰ حاصل کر کے اسی کے مطابق عمل کیا جائے۔

تیسرا مرحلہ

تقسیم میراث کا تیسرا مرحلہ جو سب سے بڑا مرحلہ ہوتا ہے وہ یہ کہ وارثوں کے درمیان ان کے حق اور حصوں کی تعیین کے بعد عملی طور پر اس کی تقسیم کس طرح کی جائے، کیونکہ کسی آدمی کے انتقال کے بعد اس کے ترکہ میں بسا اوقات مختلف قسم کے سامان ہوتے ہیں، اور بہت سے سامان ایسے بھی ہوتے ہیں جو ناقابل تقسیم ہوتے ہیں جیسے چھوٹی دکان، مکان، گاڑی، مشین، چکی وغیرہ، ان کی تقسیم ناممکنات میں سے ہے، لیکن شریعت نے اس کا بھی طریقہ بتلایا ہے، ہمارے فقہاء کرام نے اس کو ''کتاب القسمة'' کے عنوان سے تفصیل سے بیان کیا ہے، اور ہر مشکل کا حل اور پیچیدہ مسئلہ کی صورت بتلائی ہے، ناقابل تقسیم اشیاء میں ''مھایاة'' یعنی باری باری اس شئی کے استعمال کا طریقہ بتلایا ہے، یا جملہ اشیاء و سامان کی قیمتوں کا اندازہ کرنے یعنی کل ترکہ کی مجموعی قیمت کا اندازہ لگا کر اسی قیمت کے تناسب سے بعض چیزیں بعض ورثاء کو اور بعض چیزیں دوسرے بعض ورثاء کو دینے کا طریقہ بتلایا ہے، اختلاف کی صورت میں قرعہ اندازی کرنے کی ہدایت کی ہے، شامی عالمگیری وغیرہ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

الغرض عملی طور پر تقسیم میراث کا عمل اگرچہ مشکل کام ہے لیکن شریعت نے اس کو آسان کر کے بتلایا ہے، اسلامی حکومت میں حکام کی طرف سے ایسے باصلاحیت افراد قاضی و قاسم متعین ہوتے تھے جو اسی کام کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے تھے، اس کام کو انجام دینے میں وقت صرف ہوتا اور دماغ سوزی بھی ہوتی ہے، اس لئے شریعت نے حکم دیا ہے کہ تقسیم املاک و تقسیم میراث کا کام جو بھی انجام دے گا، وہ اپنی اس محنت کے عوض خاطر خواہ اجرت کا مستحق ہوگا، اور اس کی اجرت ان شرکاء املاک یعنی وارثوں سے ان کے حصہ کے مطابق وصول کی جائے گی، یہ ساری تفصیلات کتب فقہ ہدایہ، شامی، عالمگیری وغیرہ میں موجود ہے۔

الغرض تقسیم میراث کے عمل کو انجام دینے کے لئے ان تین مراحل پر بھی نظر کرنا ضروری ہے، جس کے بغیر یہ عمل انتہاء کو نہیں پہنچ سکتا، اور نہ ہی تقسیم میراث کا فائدہ وارثوں کو حاصل ہوگا، کیونکہ وارثوں کے حصہ کی تعیین تو محض ایک کاغذی کارروائی ہے، وہ بھی ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر عملی تقسیم بھی ناممکن ہے، لیکن اصل مقصود عملی تقسیم ہے، عام طور پر اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اس میں عموماً ورثاء کے حصوں کو بیان کیا جاتا ہے، عملی طور پر اس کی تقسیم کس نوعیت اور کیفیت سے ہونا چاہئے عموماً اس سے تعرض نہیں کیا جاتا، ضرورت اس کی ہے کہ تقسیم میراث کی عملی صورت اختیار کرنے کا بھی لوگوں کو طریقہ بتلایا جائے، اور اس سے ان کو آگاہ کیا جائے۔ واللہ اعلم

حررہ العبد محمد زید

۱۵/ جمادی الاول ۱۴۴۲ھ